G. U. L Patna.
گورنمنٹ اردو لائبریری
۱۹۳۸

Acc-No
8956

سلامت علی مہدی کا ہیبتناک ناول

تابوت

ایک ہیبتناک ناول

تابوت

سلامت علی مہدی

📚ادب سے محبت کرنے والوں کے لیے خواص پیشکش!

📙 اردو کتابوں کا چینل

URDU BOOKS CHANNEL

https://t.me/Library_Urdu

▶️ Join Now

اگر آپ

📖نایاب اور منفرد ناولز،

✨ حوصلہ افزا کتابیں،

🕌 دینی و مذہبی کتب اور

🌍 مختلف زبانوں میں ترجمہ شدہ ادب کی تلاش میں ہیں، تو ہمارے خصوصی

📱 ٹیلیگرام چینل سے ضرور جڑیں اور

📚 قیمتی ادبی خزانے سے لطف اندوز ہوں۔

🔍 ہمارے چینل میں آپ کو ملے گا:

- 📘 منفرد اور نایاب ناول
- 💡 حوصلہ افزا اور اصلاحی کتابیں
- 🕋 دینی و مذہبی کتب اور مواد
- 🌐 مختلف زبانوں میں ترجمہ شدہ ادب
- 📰 معیاری رسائل
- 🎁 اور بہت سا نایاب ادبی مواد
- 🔔 ابھی جڑنے کے لیے "Join Now" بٹن یا لنک پر کلک کریں!

📕 ہندی کتابوں کے چینلز

HINDI BOOKS CHANNEL

https://t.me/Hindi_Books_Library

(مذہبی، آزادی، تاریخ وغیرہ)

Join Now ▶️

---

https://t.me/Book_Hindi

(نئی اور پرانی کتابیں)

📚

📗 انگریزی کتابوں کے چینلز

ENGLISH BOOKS CHANNEL

https://t.me/Google_Ebooks

Join Now 📘

---

https://t.me/English_Library_Books

📗

🔗 ریختہ بکس

https://t.me/Rekhta_Books

✅ Join Now

GHAYEL

ناشر :- زندے رضا مہدی

قیمت :- پانچ روپے -/5

شائع کردہ : پرواز بکڈپو نظیر آباد۔ لکھنؤ

طابع : یونائیٹڈ انڈیا پریس۔ لکھنؤ

مصر کی شہزادی زلیخا ۳½ ہزار سال سے اپنے
تابوت میں سو رہی ہے ـــ۔ اُسے مت جگاؤ

تابوت کے جملہ حقوق بحق پرواز بکڈپو۔ نظیر آباد لکھنؤ
محفوظ ہیں

یکے از مطبوعات پرواز

URDU LIBRARY
ACC NO
8956
8.11.87

پہلی بات

تابوت ایک ہیبتناک ناول ہے جو میں اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ ہیبتناک ناولوں کا سلسلہ کوئی نئی بات نہیں ہے، مغربی ادب میں اس موضوع پر بے شمار ناول لکھے گئے اور ایک زمانے میں پسند بھی بہت کیے گئے۔ لیکن اب مغربی ادب میں اس موضوع پر سنّاٹا طاری ہے اور مغرب کے ناول نگاروں کا قلم بالکل خاموش ہو گیا ہے۔ غالباً اس لیے کہ وہ روح کے مقابلہ میں مادّہ کو زیادہ طاقتور سمجھنے لگے ہیں۔

اُردو ادب میں یہ سلسلہ مغرب سے آیا اور ہیبتناک ناولوں کے بعض ترجمے اردو میں بےحد پسند کیے گئے۔ میں بھی اس ادب سے بےحد متاثر تھا چنانچہ میں نے بھی اس سلسلہ کا ایک ناول زرد لکھا۔ جو ہندوستان اور پاکستان کے اُردو داں طبقہ میں بےحد پسند کیا گیا۔

یہ زمرّد کی کامیابی ہی تھی جس نے مجھے تابوت لکھنے پر مجبور کیا، اور میں اپنے قارئین کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ یہ ناول بھی بےحد پسند کریں گے کیونکہ یہ مصر کی ایک ایسی شہزادی کی کہانی ہے جو تین ہزار سال تک ایک زندہ ممی کی صورت میں ایک تابوت میں لیٹی رہی اور اس کی روح اس انسان کو تلاش کرتی رہی جو اسے اس نیند سے بیدار کر دے۔

اور وہ بیدار ہوئی بھی — لیکن کیسے؟ یہ آپ یہ ناول پڑھ کر ہی معلوم کر سکیں گے۔

آپ کا اپنا

سلامت علی مہدی

Govt. Urdu Library
8956

باب (۱)

سورج ڈوب رہا تھا، تاریکی بڑھتی جا رہی تھی اور سلیم چاہتا تھا کہ جلد از جلد قطب مینار کی مضافاتی بستی مہرولی پہونچ جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی خوبصورت موٹر کی رفتار اور تیز کر دی۔ ڈوبتے ہوئے سورج کے آخری شعاؤں کے رقص کا منظر سلیم کو بیحد پسند تھا اس لئے اس نے موٹر کی تیز رفتاری کے باوجود مغرب کی طرف نظر ڈالی۔ سورج بتدریج ڈوب رہا تھا، سیاہ بادلوں کے ٹکڑے کسی راہب کے کالے لبادہ کی مانند آسمان پر لہرا رہے تھے۔ اور شفق کی سرخ و سفید شعاعیں فضا میں اس طرح کھنچی ہوئی تھیں جیسے کسی نامعلوم ہاتھ نے چند نقرئی تاروں کے ذریعہ زمین و آسمان کے درمیان کوئی روحانی رابطہ قائم کرنے کی ناکام جدّوجہد کی ہو۔

آسمان کے نیلگوں پردے پر کالی گھٹاؤں کا زور بڑھتا جا رہا تھا، قدرتی مناظر کو تاریکی نے اپنی آغوش میں چھپا لیا تھا اور سلیم ہر لحہ موٹر کی

رفتار بڑھاتا جا رہا تھا، اس کو ڈر تھا کہ بارش ضرور ہوگی اس لیے وہ چاہتا تھا کہ بارش سے قبل وہ مہرولی کی آبادی میں داخل ہو جائے — جہاں اسکا ایک دوست اپنے ایک تفریحی مکان میں، بہت بےچینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

دفعتاً تیز ہوا چلنے لگی اور سلیم نے موٹر کی رفتار سست کر دی۔

ایک لمحہ کے لیے سلیم نے سوچا کہ مہرولی جانے کے بجائے وہ کیوں نہ اپنی کوٹھی واپس چلا جائے، لیکن پھر اس نے اپنا خیال بدل دیا کیونکہ اول تو اسے اپنے منتظر دوست کا خیال آیا اور پھر اسے مہرولی کی پر سکون آبادی کا خیال آیا۔ جو اسے دہلی کی مضافاتی آبادیوں میں سب سے زیادہ پسند تھی، اس وقت بھی وہ اپنے دوست راشد سے زیادہ مہرولی[1] کے بارے میں سوچ رہا تھا "یہ چھوٹا سا قصبہ انسانی زندگی، اس کے نشیب و فراز اور اس کے دکھ سکھ کی کتنی صحیح عکاسی کرتا ہے۔ اس کے در و دیوار میں، اس کے کھنڈرات کے لامتناہی سلسلہ میں، اس کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی جاذب نظر شکستہ قبروں کے کتبوں میں، اس میں بنے ہوئے مہیب پھاٹکوں میں۔ تاریخی باؤلیوں میں اور مغل شاہزادوں کے ان عشرت کدوں میں جن کا سارا حسن اور سارا نکھار زمانہ نوچ چکا ہے — کتنی زبردست تاریخ چھپی ہوئی ہے — اس آبادی میں ترک آئے، پٹھان آئے، غلام آئے، ایرانی آئے، مغل آئے۔ اور ہر ایک نے اس کو اپنی آماجگاہ بنا کر یہاں اپنی سطوت کی

---

[1] مہرولی قطب مینار کے قریب ایک پرانی بستی ہے۔

یادگار رہیا قائم کیں ۔ یہی تو وہ آبادی ہے جہاں پرتھوی راج نے اپنی محبو
رانی سنجوگتا کے لیے ایک عالیشان محل بنایا اور یہی وہ علاقہ ہے جہاں سمراٹ
اشوک نے ساری دنیا تک گوتم بدھ کا پیغام نجات پہونچانے کے لیے لوہے
ایک بڑی لاٹ نصب کرائی ۔

اس نے سوچا "ماضی نے زمین کے اس چھوٹے سے نقطہ کو کتنی اہمیت د
لیکن آج ۔ آج نے اس کے ساتھ کتنا ظلم کیا ہے ۔ ناہموار تنگ سڑکیں
پیچیدا گلیوں میں ابھرے ہوئے بے ترتیب پتھر، ہر جانب سڑے اور ٹھہر
ہوئے پانی پر بیٹھنے والے بھنبھناتے ہوئے مچھر ۔ لیکن اس بدحالی اور زما
کی کج روی کے باوجود یہاں کا ماحول کتنا سادہ اور زندگی کی تمام حقیقتو
کتنا قریب ہے ۔ یہاں کی ہواؤں میں کتنا ابدی سکون اور یہاں کے منا
میں کتنی آسودگی ہے ۔ اور پھر جیسے اس نے سوچا کہ "کہیں یہی تو وہ تمام و
نہیں ہیں جن کی بنیاد پر پرتھوی راج نے سنجوگتا کے ساتھ محبت کے ازدو
گیت گانے کے لیے اسی مقام کو پسند کیا، اشوک نے اپنے انتہائی مذہبی جذ
کا مظاہرہ کرنے کے لیے یہی جگہ منتخب کی اور مسلمان بادشاہوں نے ا
سلطنت کی شان و شوکت کا دبدبہ بٹھانے کے لیے یہیں اپنا یادگار ر
قائم کیں ۔"

موٹر چلاتے چلاتے سلیم نے مزید سوچا "جب دوپہر کا دن اتنا رومان
اور شام اتنی کیف آور ہوتی ہے تو پھر یہاں کی رات کتنی حسین ہوگی ۔
پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں رات کی تاریکی میں وہ حسینائیں بھی آتی ہوں وہ روحیں

جو اپنی زندگی میں ناکام رہی ہوں ۔۔۔ وہ روحیں جن کی تمنائیں ادھوری رہ گئی ہوں ۔۔۔ وہ روحیں جن کے محبت بھرے گیتوں نے خود ان کی نگاہوں کے سامنے دم توڑ دیا ہو ۔۔۔ وہ روحیں ۔۔۔ جو اپنے دشمنوں سے انتقام نہ لے سکی ہوں ۔۔۔ اور وہ روحیں جنھوں نے اپنے خاکی جسم چھوڑنے کے بعد بھی اپنے جسم سے اپنا پیار نہ ختم کیا ہو ۔۔۔"

اور جیسے ان بھٹکی ہوئی روحوں کا تصور کر کے سلیم کانپ گیا ۔۔۔ راستہ کتنا سنسان ہے ۔۔۔ تاریکی کتنی بھیانک ہے ۔۔۔ اور دہلی ابھی چار میل دور ہے "نہیں نہیں وہ اس راستہ سے دہلی نہیں جائیگا ۔۔۔ وہ اس طرف سے نہیں جائیگا جدھر کچھ آبادی بھی ہو اور صرف موت کے نہیں زندگی کے بھی آثار ہوں ۔۔۔" اور سلیم نے یہ فیصلہ کرتے ہی اپنی موٹر ایک کچے راستے پر موڑ دی ۔

دور بہت سے گیدڑوں کے چلانے کی آوازیں آئیں اور سلیم کو ایسا لگا جیسے بہت سی بھٹکی ہوئی روحوں نے ایک ساتھ بین شروع کر دیا ہو ۔ اس کے ہاتھ کپکپا گئے ۔۔۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ سلیم خود اپنے آپ پر مسکرا دیا "ہونہہ روح اسی وقت تک طاقتور ہے جب تک اس کے پاس جسم ہے ۔ جسم کے بغیر روح بالکل ایسی ہی نرم و نازک شئے ہے جیسے پھول کے بغیر اسکی مہک ۔۔۔ جو پھول کے جسم سے نکلنے کے بعد باقی تو رہتی ہے لیکن اس طرح کہ خود اس کے وجود کی کوئی اہمیت اور افادیت نہیں رہتی ۔۔۔"

"لیکن یہ روح ہے کیا ۔۔۔؟" اس کے ذہن نے اس سے سوال کیا اور

جواب کی تلاش میں وہ خود ہی اپنے ذہن کے تانے بانے میں الجھ کے رہ گیا۔
وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی اچھی یا بری روح کے مسئلہ میں الجھ کر رات کی
خوشگوار ساعتیں برباد کرے اس لیے وہ دوبارہ مہرولی کے بارے میں
سوچنے لگا۔ چنانچہ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "کچھ بھی ہو ۔۔۔۔ یہ
سمجھنا اور فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ اس خوبصورت اور چھوٹے سے قصبہ کی
تاریخی معماری میں کس نے زیادہ حصّہ لیا ہندو راجاؤں نے جن کا تذکرہ
سنسکرت کی قدیم کتابوں میں پایا جاتا ہے یا مسلمان شہنشاہوں نے جن کی
تہذیب، جن کی معماری ذہانت اور جن کا تمدن و ادب آج بھی کسی نہ کسی
صورت میں یہاں موجود ہے اور جن کی زندگی کے بہت سے اسرار سینہ بسینہ
منتقل ہو کر آج بھی مہرولی کے سن رسیدہ مولویوں اور کسی مزار کے مجاوروں
کے دلوں میں محفوظ ہیں"

سلیم کی کار کبھی کبھی پتھروں سے ٹکرا کر یا گڈھوں میں اتر کر ہچکولے
کھا جاتی تھی لیکن اس کے خیالات کا سلسلہ بدستور قائم رہا "یہ خوبصورت،
اٹھتا ہوا، ابھرتا ہوا، فضا میں بلند ہوتا ہوا اور آسمان کی بلندیوں کو چھوتا
ہوا مینار آخر کس کا مان لیا جائے ۔۔۔ مسلمان مورخین نے تاریخی دلائل سے
یہ ثابت کر دیا ہے کہ التمش ایک بہترین معماری ذہانت کا حامل تھا اور اس کے
اسی ذہن کی تمام تر قوتیں مدتوں جد و جہد کرتی رہیں تب جا کر یہ قطب مینار عالم وجود
میں آیا ۔۔۔ لیکن اس کے بالکل برعکس پنڈت ہردیو سہائے دہلوی کا دعویٰ
ہے کہ یہ تمام عمارتیں ان راجاؤں اور مہاراجاؤں کی ہیں جو مسلمان حملہ آوروں

کی آمد تک اس خطۂ زمین پر حکمران رہے ۔ بہر حال "سلیم نے جیسے فیصلہ کیا ہے" ان کھنڈرات میں مسلمان شہنشاہوں کی تہذیب اور ان کی شان شوکت دفن ہو یا پرانے راجاؤں اور مہاراجوں کی کہانیاں ۔ یہ چھوٹی سی دنیا ہے بہت پیاری ۔ آج بھی یہ بستی چاندنی میں بھیگی ہوئی ایسی زندگی معلوم ہوتی ہے جس میں حرکت نہ ہو ، رقت نہ ہو ، شور نہ ہو ، ہنگامہ نہ ہو ۔ صرف سکون ہو اور یہ سکون اتنا ابدی اور اتنا خوابناک ہو کہ دل میں ماضی کی تصویریں اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ دکھائی دیں ۔ اور جیسے یہ قصبہ کوئی قصبہ نہ ہو چاندنی اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی ایک ایسی دنیا ہو جس میں لطیف و پاکیزہ روحیں آباد ہوں ، اور جہاں بے آواز وقت ماضی اور مستقبل کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس طرح گذرتا ہو جس طرح حیات انسانی کے دن ۔

اب راستہ بھی خراب ہو گیا تھا اور تاریکی بھی کافی بڑھ گئی تھی ، سڑک پر دور دور تک ایک متنفس بھی نہیں نظر آتا تھا جبکہ اس سڑک پر آمد و رفت ہمیشہ رہتی تھی ، تنہائی کے ان احساسات نے فطری طور پر سلیم کو فکرمند کیا اور اس نے موٹر کی رفتار تیز کی ۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اچانک اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے خیالات میں کھو کر غلط راستہ پر آ گیا ہے کیونکہ یہ راستہ قطب مینار کے بجائے چراغ[عہ] دہلی کی طرف جاتا تھا ۔ چنانچہ اگلے چوراہے پر اس نے اپنی موٹر گھمائی اور اس سڑک پر پوری تیز رفتاری سے چھوڑ دی

عہ چراغ دہلی بھی دہلی کی ایک مضافاتی آبادی ہو اور یہاں ایک مشہور بزرگ کا مزار ہے

جو بند آنکھوں کے سامنے بھی اس کو سیدھی مہرولی پہونچا سکتی تھی۔

اسی سڑک پر جبکہ وہ مہرولی کو اپنی منزل بنائے تیزی سے جا رہا تھا اچانک اسے بیچ سڑک پر ایک آدمی چلتا ہوا دکھائی دیا۔ حادثہ کے خوف سے اس نے ہارن بجایا ہارن کی آواز سنتے ہی یہ آدمی ایک کنارے ہوکر کھڑا ہوگیا اور جب سلیم کی موٹر اس کے قریب سے گذری تو اس نے دیکھا یہ شخص ایک نیلے جبّہ سے اپنا پورا جسم چھپائے ہوئے ہے سر پر عمامہ نما کوئی شئے ہے اور بائیں شانے پر ایک ایسا عربی رومال پڑا ہے۔ جو عموماً قاری، حاجی یا حافظ استعمال کرتے ہیں۔

"اس تنہائی سنسان اور تاریک راستہ پر یہ اجنبی کون ہوسکتا ہے" سلیم نے سوچا۔ "اس کے خدوخال تو مصریوں سے ملتے جلتے ہیں، ویسا ہی سنہرا رنگ، اونچی ناک، چوڑی پیشانی، لمبا قد۔ اور طاقتور ہاتھ پیر۔" ایک مرتبہ پھر اس اجنبی کو دیکھنے کا خیال سلیم کے ذہن میں پیدا ہوا اور اس نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر پیچھے کی جانب دیکھا بھی لیکن تاریکی اور موٹر کے پہیّوں سے پیدا ہونے والے گرد و غبار نے اس اجنبی کو اس کی نگاہوں سے بالکل مستور کردیا تھا۔

سلیم نے موٹر کی رفتار پھر تیز کردی۔

لیکن مصری خدوخال والا پُر اسرار اجنبی بدستور اس کے ذہن پر مسلّط تھا۔ اور اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ اس کے دل میں ہمیشہ سے مصر کے اسرار چھائے رہتے تھے، مصر کے بن دیکھے قدیم حسن کا سحر اس پر ایک

عرصہ سے طاری تھا، تاریخ کے اوراق میں گمشدہ مصر کی ہر شہزادی قلو پطرہ بن کر اس کے خیالات کی وسعتوں میں سما گئی تھی، اور بچپن ہی سے مصر کا حسن اور مصر کے قدیم اسرار اس پر اپنا جادو پھیلا رہے تھے۔

قدیم مصر ہمیشہ سے اس کا ایک انجانا خواب رہا تھا، کیونکہ اس کے والد خان بہادر عازم الدین کو جو ایک کروڑ پتی تاجر تھے ان کو مصریات سے دلچسپی تھی اور یہ دلچسپی اتنی بڑھ گئی تھی کہ انھوں نے کشمیری دروازہ کے باہر اپنی تعمیر کردہ نئی کوٹھی کو صرف مصر کی قدیم چیزوں سے سجایا تھا، اسکی دیواروں پر قدیم مصر کے طرز پر تصویریں بنوائی تھیں اور اپنی لائبریری کو مصری عجائبات و نوادرات کا ایک عجائب گھر بنا دیا تھا، عازم الدین کی قدیم مصر سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے اس شوق پر لاکھوں روپیہ خرچ کر چکے تھے اور ان کی کوٹھی کا آرائش کا مصری انداز دیکھ کر کوئی شخص یہ کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ یہ کسی مصری رئیس کی کوٹھی نہیں ہے۔

باپ کے اس شوق کا اثر سلیم کے ذہن پر بھی پڑا تھا۔ بچپن ہی سے وہ مصری عجائبات دیکھ رہا تھا، ابوالہول اور اہرام کی تصویریں دیکھ رہا تھا۔ مختلف مجسّے دیکھ رہا تھا۔ قدیم مصری زبانوں کے کتبے دیکھ رہا تھا اور اب جب کہ وہ خود تعلیم سے فارغ ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھ چکا تھا اس نے خود مصر سے دلچسپی شروع کر دی تھی۔ وہ مصر کے قدیم اسرار اور اسکی تہذیب سے تو متاثر تھا ہی لیکن جوان ہونے کی وجہ سے وہ سب سے زیادہ متاثر شہزادیوں کی ان خوبصورت تصاویر سے تھا

جو اسکی لائبریری میں لٹکی ہوئی تھیں اور جن کو وہ عالم محویت میں گھنٹوں دیکھا کرتا تھا۔

عالم تصور میں وہ مصر کی سیر کرتا ہوا موٹر چلاتا رہا۔۔۔ اچانک بادل گرجے، بجلی چمکی اور تیز بارش شروع ہو گئی۔۔۔ رفتار دھیمی کر کے اس نے موٹر کی اگلی دونوں بڑی بتیاں جلا دیں۔۔۔ اور اس روشنی میں یہ دیکھ کر اسکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ ایک اونچی دیوار کے بالکل قریب ہے۔۔۔ تعجب اور حیرت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ وہ موٹر آگے بڑھاتا رہا ۔۔۔ اچانک خوفناک گرج کے ساتھ بجلی پوری شدت کے ساتھ چمکی۔۔۔ اور اس کی تیز روشنی میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کو ہی نہیں دنیا کے ہر ذی ہوش کو دیوانہ کرنے کے لیے کافی تھا۔۔۔

تقریباً بیس گز کے فاصلہ پر پتھر کا ایک پرانا مکان تھا جس کے ایک برج کے نیچے ایک عورت کھڑی ہوئی تھی۔۔۔ جس کے جسم پر سیاہ لباس تھا سنہرے بال ہواؤں میں اڑ رہے تھے، سفید رنگ بجلی کی روشنی میں چاند کی طرح چمک رہا تھا اور آنکھیں کنول کے پھول کی طرح جوانی سے مخمور تھیں۔۔۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی۔۔۔ اور یہ وہی شہزادی تھی۔۔۔ مصر کی شہزادی۔۔۔ وہی جس کی تصویر سلیم کی لائبریری کی ایک دیوار پر بنی تھی۔۔۔ قدیم مصر کی شہزادی ۔۔۔ جس پر ہمیشہ اسکی محبت بھری نظریں پڑا کرتی تھیں۔۔۔ اور جو بچپن سے لیکر اب تک اسکے ذہن کے ہر گوشے پر چھائی ہوئی تھی۔۔۔ اسکی ان دیکھی محبوبہ کی طرح۔۔۔ زندگی کے دلکش خواب کی طرح۔۔۔ قدیم مصر کے اسرار کی طرح۔۔۔

اور وہ چیخ پڑا۔ "تم کون ہو" اور یہ کہتے ہی اس پر ایک عجب دارفتگی سی طاری ہو گئی۔ کچھ دیوانگی اور لاشعوری سی کیفیت، موٹر کا اسٹیرنگ اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ ڈگمگاتی ہوئی موٹر ایک مہیب آواز کے ساتھ کسی درخت سے ٹکرائی، اور وہ اچھل کر باہر گر پڑا۔

وہ بالکل بیہوش تھا۔

اور اسکی زندگی کے دلکش خواب کی دلفریب تعبیر اسے موت کے قریب لے گئی تھی؟

باب ــــــــ ۲

سلیم نے بہت آہستہ آہستہ اپنی آنکھیں کھولیں ۔ ایک لمحہ کے لئے سامنے کی طرف دیکھا اور پھر جلدی سے آنکھیں بند کر لیں ۔ یقیناً کوئی بات ضرور تھی ، وہ حلفیہ کہہ سکتا تھا کہ آنکھیں کھولنے سے صرف ایک منٹ پہلے وہ مصر کی کسی عالیشان عمارت کے ایک ستون سے کمر لگائے بیٹھا ہوا ایک معبد کی کھڑکی کو بغور دیکھ رہا تھا ۔ جو دیوار میں کافی بلندی پر تھی اور جس میں ایک حسن جہاں سوز زرد ہیرہ اپنے انتہائی مقدس لباس میں کھڑی ہوئی پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف مسلسل دیکھ رہی تھی ۔ دھیرے دھیرے روشنی کم ہونے لگی اندھیرا پھیلنے لگا اور پھر اس پھیلتی ہوئی تاریکی نے حسن کے اس عدیم المثال پیکر کو اس کی نظروں سے پنہاں کر دیا ۔

اور اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھول دیں ۔ اس لئے کہ وہ دوبارہ یہ

منظر نہیں دیکھ سکا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ وہ ایک صاف ستھرے کمرے میں ایک سفید بستر پر لیٹا ہوا ہے۔ سر پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں، سارا جسم درد سے بےچین ہے اور قریب کی ایک میز پر دوائی کی شیشیاں، کچھ پیالے اور گلاب کے تازے پھولوں سے سجا ہوا ایک گلدستہ رکھا ہوا ہے۔ تھکان محسوس ہونے پر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

سلیم کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کمرے میں اس کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے یا نہیں۔ ابھی تک اس پر ایک خواب کی سی کیفیت طاری تھی کہ ایک ملائم، نازک لیکن سرد ہاتھ کا لمس اپنی پیشانی پر اسے محسوس ہوئی اپنی آنکھوں کے پرسکون پردوں کو تیسری بار اس نے آہستہ آہستہ اٹھایا اور اب اس نے دیکھا کہ محبت اور شفقت کے جذبات سے لبریز دو نرگسی آنکھیں اسکی طرف دیکھ رہی ہیں۔ تھکی تھکی نگاہوں کے ساتھ اس نے ماحول کا جائزہ لیا۔ اور اب اسے معلوم ہوا کہ وہ کسی اسپتال میں ہے اس کے قریب ایک نرس کھڑی ہوئی ہے۔ اور وہ ایک ایسے کمرے میں ہے جس میں نرس کی بڑی بڑی آنکھوں اور گلاب کے سرخ پھولوں کے علاوہ ہر چیز سفید ہے۔

"شکر ہے کہ بالآخر آپ ہوش میں آ ہی گئے" نرس نے دل آویز اور مدھم ہلکی آواز میں خوش ہو کر کہا۔

سلیم نے چاہا کہ جواب میں ہاں کہے۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ اپنے حلق سے کوئی آواز نہ نکال سکا۔ اس نے اپنی عمر کے کسی حصے میں بھی خود کو

اتنا نحیف و کمزور نہیں محسوس کیا تھا۔ لیکن کمزوری، نقاہت، درد اور تکلیف کے باوجود ایک مرتبہ پھر اس کا ذہن دہلی جانے والی سڑک کے کنارے برج کے نیچے کھڑی ہوئی اس پر اسرار زندہ عورت کی طرف چلا گیا۔ جس کی تصویر اس کی لائبریری میں موجود تھی جس کو وہ اپنے بچپن سے دیکھ رہا تھا اور جس کے بارے میں اسے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ فرعون دوم کے خاندان کی کسی خوبصورت شہزادی کی ایک قدیم تصویر ہے اور جسے اس کے باپ نے ہزاروں روپیہ خرچ کر کے مصری نوادرات کے کسی تاجر سے خریدا تھا۔

سلیم کے چہرے پر بےچینی اور تکان کے آثار دیکھ کر نرس نے اپنا علیحدہ انداز میں کہا۔ "یہ دوا پی لیجئے۔ کچھ دیر آرام کرنے کے بعد آپ اپنی طبیعت میں ایک حیرتناک خوشگوار تبدیلی محسوس کریں گے۔"

اور یہ دوا پیتے ہی سلیم سو گیا۔

رات گئے اسکی آنکھ کھلی، اب واقعی درد کم تھا، طبیعت کی گرانی دور ہو چکی تھی اور وہ خود کو آرام میں محسوس کر رہا تھا۔ کمرے میں لیمپ کی دھیمی دھیمی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور وہی نرس، اس کے پلنگ کے بالکل قریب ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ سلیم نے غور سے چاروں طرف دیکھا اور اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد کہ وہ واقعی کسی اسپتال کے کمرے میں ہے نرس سے پوچھا

"میں یہاں کیسے آیا۔"

"تغلق آباد کے کھنڈروں والی سڑک پر آپ کی موٹر ایک درخت سے ٹکرا کر الٹ گئی تھی اور ایک عورت آپ کو یہاں تک پہونچا گئی ہے۔"

اس وقت آپ اردون اسپتال میں ہیں اور خطرہ کی حد سے نکل چکے ہیں۔" نرس نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

" اتنا تو مجھے خود یاد ہے کہ میری موٹر کو حادثہ ہو گیا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ کون عورت مجھے یہاں تک پہونچا گئی ہے" سلیم نے گھبرا کر پوچھا اور ایک مرتبہ پھر اُسے اپنی لائبریری والی مصری شہزادی کی تصویر یاد آ گئی۔

سلیم کے اس سوال کا جواب دینے کے بجائے نرس کی تیوریوں پر خفیف سے بل پڑ گئے اور اس نے تقریباً تحکمانہ انداز میں کہا۔ مسٹر سلیم ــــ ڈاکٹر بیگ کے حکم سے آپ کو زیادہ گفتگو کرنے کی اجازت قطعی نہیں دی جا سکتی ــــ اب آپ دوا پیجیے اور آرام کیجئے"ــــ

" لیکن نرس تمھیں میرا نام کیسے معلوم ہوا ــــ ؟" سلیم نے انتہائی حیرت سے پوچھا کیونکہ وہ بیہوشی کے عالم میں یہاں پہونچایا گیا تھا اور کسی کو اسکا نام تک نہیں معلوم تھا"

" یاد رکھیے کہ میں آپ کے اس آخری سوال کا جواب دے رہی ہوں اس کے بعد آپ بالکل خاموش رہیے گا ــــ سنیئے ــــ جس عورت نے آپ کو یہاں تک پہونچایا تھا اسی نے رجسٹر پر آپ کا نام اندراج کرایا، اسی نے بتایا کہ آپ کا نام سلیم الدین ہے اور آپ کے والد کا نام خان بہادر عازم اللہ حسن ہے ــــ اس نے یہ بھی بتایا کہ آپ کی شکستہ حال موٹر بھی نئی دہلی کے حمید گیرج میں مرمت کے لیے پہونچا دی جائے گی ــــ اس عورت نے خود اپنا کوئی پتہ نہیں بتایا اور ہمارے مزید کسی سوال کا جواب دیئے بغیر اٹھی چلی گئی ــــ "

نرس نے ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے کے انداز میں اپنا پورا جملہ ادا کیا۔۔۔
اور سلیم کے ماتھے پر پسینہ آ گیا۔۔۔۔
"یقیناً یہ کسی روح کا کام ہے۔۔۔ ورنہ کسی اجنبی کو کیا معلوم کہ میں کون ہوں، میرا نام کیا ہے اور میں کس کا بیٹا ہوں۔۔۔" سلیم نے سوچا اور خوف کی وجہ سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ اور سوچے اور نرس اس کے کچھ اور سوالوں کا جواب دے۔۔۔ لیکن غالباً نرس اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی الجھنوں کو پہچان گئی اس نے سلیم کو دوا پلائی اور ایک مرتبہ پھر اپنا بھرے انداز میں سونے کے لیے کہا۔ لیکن سلیم کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔۔۔ اس نے محض نرس کو مطمئن کرنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ ذہنی اعتبار سے وہ ماضی کے ان تمام واقعات پر مسلسل سوچ رہا تھا۔۔۔ اور اس کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا کہ سب کیسے ہوا؟
رات اسی طرح گذرتی رہی۔۔۔ اور لاتعداد الجھنوں کو دل میں دبائے سلیم بھی سو گیا۔۔۔ اور جب وہ بیدار ہوا تو اس نے دیکھا کہ سورج کی روشنی پھیل چکی ہے اور نرس کے قریب ایک بوڑھا ڈاکٹر بھی کھڑا ہوا ہے۔۔۔ قبل اس کے کہ سلیم کوئی سوال کرتا ڈاکٹر نے انتہائی مشفقانہ انداز میں گفتگو کی ابتدا کر دی۔ اس نے کہا۔ "آپ گذشتہ ۴۸ گھنٹے سے ہمارے اسپتال کے ایک اسپیشل وارڈ میں زیر علاج ہیں۔۔۔ ایک گمنام عورت انتہائی زخمی حالت میں آپ کو یہاں تک پہنچا گئی، یہ آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آپ کو بروقت طبی امداد مل گئی اور ہمیں آپ کے والد کا نام معلوم ہو گیا

ورنہ آپ کا بچنا محال ہو جاتا"

"لیکن میرے والد اس وقت کہاں ہیں"۔

"وہ خود میرے دفتر میں آپ سے ملاقات کے لیے بےچین ہیں۔۔۔ آپ اطمینان سے لیٹے رہیئے، میں ابھی ان کو یہاں بھیجتا ہوں۔۔۔" ڈاکٹر نے ہمدردی سے جواب دیا اور سلیم کے سر پر بندھی ہوئی پٹیوں کا معائنہ کرنے دنیز نرس کو کچھ ضروری ہدایات دینے کے بعد وہاں سے چلا گیا۔

چند ہی لمحات کے بعد خان بہادر عازم الدین اس کے کمرے میں بیتابی کے ساتھ داخل ہوئے اور انھوں نے آتے ہی سلیم کو اپنی چھاتی سے چمٹا لیا۔

"میرے بیٹے۔۔۔ اب تم کیسے ہو؟ خدا کی قسم میں تمام رات تمھارے وارڈ کے آگے بیٹھا رہا ہوں۔ یہ تمھاری موٹر کو حادثہ کیسے ہو گیا؟ تم تغلق آباد کے کھنڈروں میں کیا کرنے گئے تھے؟ وہ کون عورت تھی جو اپنا نام اور پتہ بتائے بغیر تمھیں یہاں تک پہونچا گئی؟ جلد بتاؤ سلیم یہ سب کیوں ہوا؟" خان بہادر نے ایک ہی سانس میں لاتعداد سوالات کر ڈالے۔۔۔

"میں اچھا ہوں ابا جان۔۔۔" سلیم نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا "لیکن خدا کی قسم جس حادثہ سے دوچار ہوا ہوں اس نے ذہنی اعتبار سے مجھے بالکل معطل کر دیا ہے"۔

"مجھے بتاؤ۔۔۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی اُلجھن دور کرنے کے لیے میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔" عازم الدین نے بیٹے کی پریشانی دیکھکر کہا۔

سلیم نے اپنے باپ کو شروع سے لیکر اب تک کے تمام واقعات سنا دیئے

— اور عازم الدین تفصیل سن کر انگشت بدندان رہ گئے۔

انھوں نے سوچا — "کیا یہ ممکن ہے —؟" اور پھر خود ہی انھوں نے فیصلہ کیا کہ "سب کچھ ممکن ہے کیونکہ سلیم جس شہزادی کی تصویر کا تذکرہ کر رہا ہے وہ قدیم مصری تاریخ کے بموجب ابتک زندہ ہے —" عازم الدین نے اپنے بیٹے کی طرف ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا "دنیا یقین کرے یا نہ کرے لیکن مجھے اس امر پر پورا یقین ہے کہ بُرنج والی عورت وہی ہوگی جس کی تصویر تیری لائبریری میں موجود ہے — مجھے مصریات سے دلچسپی ہے' میں اس شہزادی کی پوری کہانی جانتا ہوں' — تم اچھے ہو کر ہسپتال سے آجاؤ پھر میں تمھیں اپنے ساتھ لیکر حادثہ کی مکمل تحقیقات کرونگا —"

"جب آپ کو اس شہزادی کے بارے میں سب کچھ معلوم ہے تو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کا نام کیا ہے اور وہ اب تک زندہ کیوں ہے —" سلیم نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ اب تک زندہ کیوں ہے یہ ایک لمبی کہانی ہے لیکن اسکا نام شہزادی زلیخا ہے یہ میں تمھاری تسلی کے لیئے بتائے دیتا ہوں —" عازم الدین نے پُرسکون انداز میں کہا "اور اب تم آرام کرو — میں ڈاکٹر بیگ سے گفتگو کرنے کے بعد چلا جاؤں گا اور شام کو پھر آؤں گا"

اور یہ کہہ کر باپ نے بیٹے کی پیشانی پر ایک بوسہ دیا اور ہلکے ہلکے قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا۔

ڈاکٹر بیگ مریضوں میں مصروف تھے لیکن پھر بھی انھوں نے عازم الدین

سے گفتگو کرنے کے لیے وقت نکال ہی لیا ہے۔

"اب آپ سلیم کے لیے فکر مند نہ ہوں کیونکہ اب انھیں کوئی خطرہ باقی نہیں ہے" ڈاکٹر بیگ نے عازم الدین کے چہرے پر تفکرات کا ہجوم دیکھ کر کہا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب۔ میں اس کے ظاہری جسموں کی طرف سے بالکل مطمئن ہوں لیکن۔ ابھی آئندہ زندگی میں اسے جن خطرات سے دوچار ہونا ہے ان کی فکر مجھے ضرور لاحق ہے۔" عازم الدین نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" ڈاکٹر بیگ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب۔ آپ میرے پرانے ملنے والے ہیں، آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھے مصر کی قدیم تاریخ اور اس کے اسرار سے دلچسپی ہے اور اپنے اس شوق کی تسکین کے لیے میں لاکھوں روپیہ بھی برباد کر چکا ہوں۔ سلیم نے حادثہ کی جو تفصیل مجھے بتائی ہے اسکی روشنی میں مجھے مجبوراً یہ اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ قدیم مصر کی ایک خوبصورت عورت شہزادی زلیخا کی روح سلیم میں دلچسپی لے رہی ہے۔

شہزادی زلیخا کو میں اس لیے جانتا ہوں کہ اسکی تصویر میری لائبریری میں موجود ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ اب تک زندہ ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ ایسے افراد جو صرف مادّہ اور اسکی ٹھوس حقیقتوں پر یقین رکھتے ہیں نہ تو سلیم کی باتوں پر یقین کریں گے اور نہ میری گفتگو پر۔ اسی لیے میں

آپ سے بحث کرنے کے بجائے آپ سے صرف امداد چاہتا ہوں ۔" عازم الدین نے سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر بیگ کی طرف دیکھا ۔

خان بہادر عازم الدین ایسے ذمہ دار اور سنجیدہ آدمی کی زبان سے اس قسم کی غیر یقینی باتوں کو سن کر واقعی ڈاکٹر بیگ کو حیرت ہوئی اور وہ خود تذبذب میں پڑ گیا ۔ اس کے سامنے صرف دو ہی راستے تھے ۔ یا تو وہ اس حکایت پر یقین کرے اور یا پھر نہ کرے ۔ اور پھر اس نے سوچا کہ یقین کر لینے میں چونکہ کوئی نقصان نہیں ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ خان بہادر کی دل شکنی نہ کرتے ہوئے نہ صرف ان کی باتوں میں دلچسپی لے بلکہ اس مسئلہ پر ان کی مدد بھی کرے ۔

ڈاکٹر بیگ کو بہر حال روحانیت پر کوئی یقین نہ تھا ۔

"مجھے پورا یقین ہے کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ بالکل سچ اور حقائق پر مبنی ہے ۔" ڈاکٹر بیگ نے مصنوعی جذبات کے ساتھ کہا ۔ "اور میں حادثہ کی تحقیقات کے سلسلے میں آپ کی ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار ہوں ۔"

"شکریہ ڈاکٹر صاحب ۔ بہت بہت شکریہ ۔" عازم الدین نے خوش ہو کر کہا ۔ "اب آپ میرے صرف چند سوالوں کا جواب دے دیں پہلے یہ بتائیے کہ جس وقت کوئی نامعلوم اور گمنام عورت سلیم کو اسپتال میں داخل کرنے آئی ۔ کیا آپ موجود تھے ؟"

"ہاں ۔ ایک آپریشن کے سلسلے میں مجھے دیر ہو گئی تھی اور میں اتفاقاً اس وقت موجود تھا ۔"

"سلیم کو کسی گاڑی میں لایا گیا تھا یا موٹر میں ۔۔۔؟" عازم الدین نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ عورت سلیم کو بیہوشی کے عالم میں ایک گھوڑا گاڑی میں. جو فٹن سے مشابہ تھی یہاں تک لائی تھی۔ آتے ہی اس نے کہا کہ خان بہادر عازم الدین کے لڑکے سلیم الدین کی موٹر کا تغلق آباد کے کھنڈروں میں حادثہ ہو گیا ہے شکستہ موٹر نئی دہلی کے حمید گیرج میں پہونچا دی گئی ہے اور سلیم بیہوشی کی حالت میں باہر گاڑی پر موجود ہے ۔ میں آپ کا نام سنتے ہی باہر آیا ۔۔۔ اور عملہ کے چند آدمیوں کی مدد سے سلیم کو گاڑی سے باہر نکالا ۔۔۔ اور عورت کی طرف متوجہ ہوئے بغیر اسے اسپشل وارڈ میں لے آیا۔"

"اس کے بعد ۔۔" عازم الدین کی بے چینی بڑھ گئی۔

"اس کے بعد مریض کا معائنہ ختم کر کے جب میں نے اس عورت کو بلوایا ۔۔ تو وہ جا چکی تھی چنانچہ میں نے فوراً آپ کو فون پر اطلاع دی اور حمید گیرج بھی فون کیا کہ کیا کوئی موٹر اس کے گیرج میں پہونچائی گئی ہے ۔۔۔ ؟ وہاں سے موٹر کی وصولیابی کا اقرار ہوا ہی تھا کہ چند منٹ کے بعد آپ خود آ گئے ۔۔"

"ہوں ۔۔" عازم الدین نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا ۔۔ "صرف ایک سوال اور"

"فرمایئے ۔۔" ڈاکٹر بیگ نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔

"فٹن کے گھوڑوں کا رنگ کیا تھا ۔۔۔"

"سیاہ ۔ بالکل سیاہ ۔ ۔ اور اسکا کوچوان ایک نیا چغہ پہنے ہوئے تھا"

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا ڈاکٹر بیگ ۔ واقعی شہزادی زلیخا فرعون کے دورِ حکومت میں جب فٹن پر سیر کرنے نکلتی تھی اس کے گھوڑوں کا رنگ سیاہ تھا"

اور عازم الدین کے اس جواب پر ڈاکٹر بیگ ایک مرتبہ پھر حیرت و استعجاب میں ڈوب گیا ۔ اور ایک لمحہ کے لیئے اس کے ذہن میں خیال آیا کہ یہ دونوں باپ بیٹے پاگل تو نہیں ہو گئے ۔ ورنہ ۲½ ہزار سال گزرنے کے بعد بھی ایک عورت کی زندگی اور پھر اسکی یہ تمام سرگرمیاں ۔ نہیں نہیں میں ان لغو باتوں پر یقین نہیں کر سکتا ۔ میں ان باتوں کو ایک کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں دے سکتا ۔ شہزادی زلیخا کا وجود ممکن ہے ۔ لیکن شہزادی زلیخا آج بھی زندہ ہے یہ میں ہرگز نہیں مان سکتا ۔"

ڈاکٹر بیگ انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ عازم الدین چلا گیا ۔

باب ــــــــ ۳

ایک ہفتہ کے علاج معالجہ کے بعد سلیم ہسپتال سے گھر واپس آگیا، لیکن حادثہ کے سلسلہ میں اسکی الجھنوں میں کوئی کمی نہیں ہوئی تھی۔ بیماری کے زمانہ میں ایک لمحہ کے لیئے بھی اس کے ذہن سے مصری شہزادی کی تصویر نہیں نکلی ــــــ نیند تو نیند عالم بیداری میں بھی جب بھی وہ آنکھیں بند کرتا اس کو تغلق آباد کے کھنڈروں کے ایک برج میں سنہرے بالوں والی ایک خوبصورت عورت اسکی طرف دیکھتی نظر آتی اور وہ گھبرا کر اپنی آنکھیں کھول دیتا۔

عازم الدین نے بھی اسے منع کر دیا تھا کہ وہ مکمل صحت یابی تک اس سے مصری شہزادی کے بارے میں کوئی بات نہیں کریگا۔ چنانچہ مسلسل ایک ہفتہ تک سلیم کے جذبات اندر ہی اندر گھٹتے رہے اور وہ اسقدر بیتاب ہو گیا کہ ابھی زخم کی مرہم پٹی ہو رہی تھی کہ وہ ہسپتال سے نکل بھاگا۔

کوٹھی میں داخل ہوتے ہی وہ سب سے پہلے لائبریری میں گیا اور وہاں اسی تصویر پر نگاہ ڈالی جس نے اسکی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔

شہزادی زلیخا کی یہ تصویر بھی نادرروزگار تھی۔ تصویر میں شہزادی باریک لباس میں اس طرح ملبوس تھی کہ اس کے جسم کے تمام نشیب و فراز نمایاں تھے، سنہری بال ہوا میں لہرا رہے تھے، ماتھے پر موتیوں کی ایک لڑی بکھری ہوئی تھی، گلے میں سونے کا ایک باریک سانپ تھا۔ لبوں پر ایک ابدی اور لافانی مسکراہٹ تھی اور ایک ہاتھ میں نیلے گلاب کا ایک تازہ پھول۔ تصویر کے پس منظر میں ایک معبد گاہ تھی جس کے بڑے دروازے پر ابوالہول کا ایک چھوٹا سا مجسمہ نصب تھا۔

سلیم عالم محویت میں نہ معلوم کتنی دیر تک اس تصویر کے نزدیک کھڑا رہا کہ اچانک لائبریری کا دروازہ کھلا۔ اور اس کے باپ عازم الدین نے دوڑ کر اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگا لیا۔

"مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ ہسپتال سے آتے ہی تم سب سے پہلے اسی تصویر کو دیکھو گے۔" عازم الدین نے انتہائی مشفقانہ انداز میں کہا اور سلیم ایک مجبوب مسکراہٹ کے علاوہ اپنے باپ کو کوئی جواب نہ دے سکا۔

عازم الدین اور سلیم ایک دوسرے کے بالکل مشابہ تھے، فرق صرف اتنا تھا کہ ایک کے بال ریشم کی طرح سفید ہو چکے تھے اور دوسرے کے سر پر سیاہ بالوں کی ترتیب قائم رہتی تھی، ایک کے چہرے پر بڑھاپے کا تجربہ اور اسکی لکیریں تھیں اور دوسرے کے چہرے پر جوانی کی سرخی اور رعنائی تھی، دونوں

صحت کے اعتبار سے جسیم تھے، رنگ و روغن دلکش تھا، اور خدوخال میں ایک خاص قسم کی رعنائی اور دلکشی تھی۔ سلیم حسن مردانہ کا ایک اچھوتا نمونہ تھا ــــ اور عازم الدین جاتی ہوئی جوانی کا ایک زندہ مجسمہ۔

دونوں باپ بیٹے اس وقت جس لائبریری میں موجود تھے وہ کسی ہندوستانی رئیس کی لائبریری ہونے کے بجائے برطانوی میوزیم کا وہ کمرہ معلوم ہوتی تھی جس کو مصری آثارِ قدیمہ سے آراستہ کیا گیا ہو۔ مصر سے عازم الدین کی دلچسپی بہت پرانی تھی، اور جب سے اس کی بیوی سلیم کو سات سال کی عمر میں چھوڑ کر لحد کے گوشے میں سو گئی تھی عازم الدین بالکل ہی قدیم مصر کے اسرار کا بن کر رہ گیا تھا۔ یہی شوق اس کا غم غلط کر رہا تھا، اور اسی شوق نے اسکی بیوی کی جدائی کے زخم پر گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ مرہم کا کام کیا تھا۔ مصر کے اسرار میں کھو کر وہ اپنی محبوب بیوی کو بھول جانا چاہتا تھا۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اس نے تمام عمر دوسری شادی نہیں کی۔

ساری زندگی کی جد و جہد کے بعد عازم الدین نے مصر کے آثارِ قدیمہ کا جو مجموعہ اکٹھا کیا تھا وہ قدیم مصری تہذیب کا ایک خزانہ تھا جو پورے ملک میں اس کے علاوہ اور کسی کے پاس نہ تھا۔ یہ مجموعہ صرف لائبریری کی آرائش تک ہی محدود نہ تھا بلکہ کوٹھی کا ہر کمرہ مصری تہذیب کا گہوارہ معلوم ہوتا تھا، چنانچہ دور دور سے لوگ اس کوٹھی کو دیکھنے آتے تھے اور اس طرح اگر ایک طرف عازم الدین کی شہرت میں اضافہ ہو گیا

تو دوسری طرف اس کی ایسے لوگوں سے بھی واقفیت ہوگئی تھی جو مورخ تھے، ڈاکٹر تھے، آثار قدیمہ کے ماہر تھے، اور علوم و فنون کے پروفیسر تھے۔

کوٹھی کا جملہ انتظام عازم کی بیوہ بہن شمیم بانو کے سپرد تھا جو بیوہ ہونے کے بعد اپنی زندگی کے پرسکون دن اپنے بھائی کے ساتھ گزار رہی تھی اور سلیم سے اپنے بیٹے سے زیادہ محبت کر رہی تھی۔ الغرض کوٹھی کی اندرونی زندگی میں اب تک کوئی انتشار نہ تھا، کوئی اضطراب نہ تھا، کوئی الجھن نہ تھی۔ خان بہادر کا کاروبار اپنے انتہائی عروج پر تھا اور وہ ہر اعتبار سے دنیا کے خوش نصیب ترین انسانوں میں سے ایک تھے۔

لیکن ۔۔۔ اب ایک نیا طوفان ان کے دروازہ پر دستک ضرور دے رہا تھا۔

دونوں باپ بیٹے شہزادی زلیخا کی تصویر کے قریب صوفے پر بیٹھ گئے اور عازم الدین نے کہا۔ "مجھے تعجب صرف یہ ہے کہ شہزادی زلیخا کی روح دوبارہ تم سے ملنے کیوں نہیں آئی ۔۔۔ یہی نہیں ۔۔۔ میری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ اس نے اپنی جھلک دکھانے کے لیے تغلق آباد کے کھنڈروں کو ہی کیوں پسند کیا۔ اگر وہ تم سے ملنا ہی چاہتی تھی تو کسی بھی تاریک رات کو تمھاری خوابگاہ میں تم کو جگا سکتی تھی۔"

"اور میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ وہ اتنے پُراسرار اور تاریک ماحول میں مجھے اپنی جھلک کیوں دکھانا چاہتی تھی۔" سلیم نے کہا۔

"صرف اس لیے کہ تم اس پر عاشق ہو جاؤ۔" عازم الدین نے کہا

ہے" اور میرے خیال میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئی ہے۔ کیونکہ جہانتک میرا تجربہ بتاتا ہے تم حادثہ کے بعد سے اب تک صرف اُسی کے خیال میں ڈوبے رہتے ہو۔"

"لیکن مجھے خود پر عاشق کرانے کا بھی تو کوئی مقصد ہوگا"

"بہت اہم مقصد ہے شہزادی زلیخا کا — اور اس مقصد کی ایک لمبی کہانی بھی ہے۔ جو میں اپنے چند احباب کے آنے کے بعد تمھیں اور سب کو سناؤں گا۔" عازم الدین نے ایک ٹھوس مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "آج تم آرام کرو — کل میں تغلق آباد کے ان کھنڈروں کی طرف چلوں گا جہاں شہزادی زلیخا نے تم کو اپنی جھلک دکھائی تھی — یقین جانو سلیم — میں شہزادی کا ممنون ہوں کہ اس نے میرے اکلوتے بیٹے کی جان بچالی — میرے بوڑھے احساسات پر یہ احسان ہے اور میں تم سے حلفیہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس کی بےچین و مضطرب روح کو اس احسان کا بدلہ ضرور ادا کروں گا —"

"مجھے پوری بات بتایئے ڈیڈی — آپ نے ابتک ہر بات ادھوری کی ہے۔" سلیم نے بےچین ہو کر کہا۔

"تم صرف تین دن انتظار کر لو — میرے چند مخصوص احباب باہر سے آنے والے ہیں ان کے آنے پر میں پوری کہانی بیان کر دوں گا" عازم الدین نے سلیم کے شانے تھپتھپاتے ہوئے کہا اور اٹھ کر باہر چلا گیا —

الجھن کم کرنے کے بجائے باپ کی گفتگو نے سلیم کی الجھنیں بڑھا دیں — بار بار وہ شہزادی کی تصویر کی طرف دیکھتا رہا اور اس کا دماغ مسلسل

سوچتا رہا کہ مجھے گرفتارِ محبت کرنے سے شہزادی کا کیا مقصد تھا ـــ؟"
لیکن سلیم کو اس سوال کا جواب نہ ملا ـــ۔

دوسرے دن ناشتہ کی میز پر عازم الدین نے اپنے بیٹے کو تغلق آباد جانے کی تیاری کے لیے کہا اور اس کے علاوہ کوئی دوسری بات نہیں کی ـــ سلیم کو حیرت تھی کہ اس زبردست حادثہ کے باوجود اور یہ جاننے کے باوجود کہ ایک رُوح نے اس کے بیٹے کو سحر زدہ کرلیا ہے اس کے باپ کے چہرے پر کوئی الجھن اور کوئی بےچینی کیوں نہیں ہے، وہ اتنا پُرسکون کیوں نظر آرہا ہے ـــ۔

کیا وہ واقعی معاملہ کی تہ پر پہونچ چکا ہے؟

ٹھیک دس بجے دونوں باپ بیٹے اپنی شاندار موٹر پر تغلق آباد کے کھنڈروں کی طرف روانہ ہوگئے۔ نئی دہلی کی صاف ستھری سڑکیں گزرنے کے بعد عازم نے سلیم سے کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ روح کا کوئی مسکن نہیں ہوتا اس لیے تغلق آباد جانا بالکل بیکار ہے لیکن پھر بھی میں وہاں اس لیے جا رہا ہوں کہ شاید میں یہ معلوم کرسکوں کہ شہزادی نے تم پر اپنا غیر معمولی خوبصورتی کا جادو چلانے کے لیے تغلق آباد کے سنسان کھنڈروں کا ہی انتخاب کیوں کیا ـــ؟ ہاں ایک بات اور ـــ کیا تم اپنی یادداشت پر زور دے کر یہ بتا سکتے ہو کہ وہ کیسا لباس پہنے ہوئے تھی ـــ؟"

"وہی تصویر والا لباس ـــ بالکل سفید اور انتہائی باریک ـــ"

سلیم نے جواب دیا اور اس کے بعد دونوں باپ بیٹے خاموش ہو گئے۔ شاید دونوں اپنے اپنے خیالات میں مستغرق تھے۔ تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ تغلق آباد کے سنسان اور غیر آباد علاقہ میں داخل ہو گئے۔ اور جب راستہ بالکل ہی ناہموار ہو گیا۔ تو عازم الدین نے موٹر روک دی۔ اب دونوں پیدل تھے۔ اور دور سے تغلق آباد کے مہیب کھنڈر نظر آرہے تھے۔

"ہم صحیح راستہ پر ہیں یا غلط راستہ پر۔ ؟ عازم نے سوال کیا۔

"مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ میری موٹر اسی سڑک پر جا رہی تھی۔"

"تو پھر ان کھنڈروں میں وہ برج تلاش کرو جس کے نیچے شہزادی کھڑی تھی"۔ اور دونوں سایہ دار گھنے درختوں میں بڑھتے گئے۔ ہر طرف تغلق آباد کے آثار کھنڈرات کی صورت میں موجود تھے۔ لیکن برج کا کوئی پتہ نہ تھا۔

دفعتاً سلیم رک گیا۔" وہ دیکھئے۔ کچی سڑک سے تقریباً چالیس گز کے فاصلہ پر وہ برج موجود ہے۔ اور وہ درخت بھی جس سے میری موٹر ٹکرا گئی تھی"۔ عازم بھی رک کر اس برج کو دیکھنے لگا۔ اور چند لمحات کے بعد دونوں اس برج کی طرف روانہ ہو گئے۔

سلیم کے ہر قدم کے ساتھ اس کے دل کی دھڑکن بھی بڑھ جاتی تھی۔ ماحول واقعی دہشتناک تھا۔ ہر طرف خاموشی تھی اور ایسے خطرات تھے جن کا انسان کو تصور تک نہیں ہوتا لیکن عازم الدین بالکل پُرسکون انداز میں

اس طرح برج کی طرف بڑھ رہا تھا جیسے وہاں کوئی شخص اس کی ملاقات کا منتظر ہو۔

نزدیک پہونچنے پر معلوم ہوا کہ یہ برج ایک شکستہ مکان کی چھت پر بنا ہے، مکان کے چاروں طرف چہار دیواری کھنچی ہوئی ہے اور بائیں گوشے پر ایک چھوٹا سا مینار بھی بنا ہوا ہے۔ عازم الدین اور سلیم غور سے مکان کے گرد و پیش کا جائزہ لیتے رہے اور اس کے بعد عازم ایک شکستہ فصیل میں داخل ہو گیا۔

فصیل کے بعد ایک اچھا خاصہ میدان تھا جس میں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی، اور جنگلی پھولوں کی بے شمار جھاڑیاں موجود تھیں۔ میدان کے بعد ایک اور چہار دیواری تھی۔ جس میں ایک محراب دار دروازہ تھا۔ اور سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔

عازم نے غور سے ان پرانی، شکستہ اور پتھریلی سیڑھیوں کو دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کی بھی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ان سیڑھیوں پر باقاعدہ جھاڑو دی گئی ہے اور وہ بالکل صاف ہیں۔

"گویا۔ اس سنسان مکان کے کھنڈر میں کوئی ذی حیات بھی موجود ہے" عازم الدین نے دل ہی دل میں کہا اور سلیم کو اشارہ کر کے زینے پر چڑھنے لگا۔ اور اس مکان میں داخل ہو کر، جو یقیناً تغلق بادشاہوں کی رہائش کا کوئی اہم حصہ رہی ہو گی دونوں باپ بیٹوں کو ایک لمحے کے لیے سناٹا سا ہو گیا۔

مکان بالکل خالی تھا۔ برج بالکل سنسان تھا۔ لیکن شکستہ مینار کے قریب ایک مسلمان بوڑھا درگاہ رب العزت میں سجدہ ریز تھا۔ حیرت اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دونوں اس بوڑھے نمازی کو دیکھتے رہے اور نماز کے بعد جب اس بوڑھے نے ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو ان پر لرزہ سا طاری ہوگیا۔

بوڑھے کی آنکھیں خون کبوتر کی طرح سُرخ تھیں، اور اس کے سرخ و سفید چہرے پر جو رُوحانی جلال تھا اس پر آنکھ نہیں ٹھہرتی تھی۔

"تم لوگ یہاں کیوں آئے — اور میری عبادت میں مخل کیوں ہوئے" بوڑھے کی گرجدار آواز سے پوری فضا گونج گئی۔

"جی — ہم —" عاذم الدین سخت دل ہونے کے باوجود ہکلا گیا۔ "میرے لڑکے کو اس برج کے نزدیک ایک حادثہ ہوگیا تھا"

"وہ سب مجھے معلوم ہے — اور یہ میرا ہی حکم تھا جو زلیخا کی روح نے تمہارے سلیم کو اسپتال تک پہونچا دیا" بوڑھے کی آواز میں اب بھی گرمی باقی تھی۔

اور بوڑھے کے اس جواب نے جیسے دونوں باپ بیٹے کے سوچنے سمجھنے اور جواب دینے کی صلاحیت ختم کر دی۔ وہ دم بخود رہ گئے۔ گتھی سلجھنے کے بجائے الجھتی ہی جا رہی تھی۔

"تو کیا یہ بوڑھا علم کی ان حدوں کو بھی پار کر چکا ہے جس کے بعد روح اور مادہ کا فرق مٹ جاتا ہے — اور فانی و غیر فانی دونوں ایک ہی

وقت میں دیکھے جا سکتے ہیں ۔" عازم الدین نے ایک منٹ کے لیے سوچا۔ اور چاہا کہ آگے بڑھ کر اس بوڑھے بزرگ کے ہاتھوں کا عقیدت بھرا بوسہ لے لے۔

"نہیں ۔" بوڑھے نے عازم الدین کو روک دیا ۔" میں اسے پرستش کہتا ہوں اور میں جانتا ہوں کہ عقیدت کا یہ مظاہرہ تم کیوں کر رہے ہو۔ سنو۔ شہزادی زلیخا کی روح بھٹک رہی ہے، وہ بیداری کے لیے بیتاب ہے۔ کوزو الحادو کے جیسے فرعون نے اس کے زندہ جسم کی ممی بنا دی تھی۔ حادثہ والی رات وہ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ کہ داسپا پر تمہارے لڑکے کی نگاہ اس پر پڑ گئی، اور وہ حادثہ ہو گیا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا ۔"

"لیکن محترم بزرگ ۔ اب میں اپنے لڑکے کی خاطر اسے بیدار کرنا چاہتا ہوں" عازم الدین نے بوڑھے کے رعب و جلال کے باوجود کہہ ہی دیا۔

"کوشش کر سکتے ہو۔ قاہرہ سے آگے لکسر[۱] سے صرف ۲۲ میل کے فاصلہ پر اس کا زمین دوز مقبرہ موجود ہے۔ جہاں وہ پتھر کے ایک تابوت میں گزشتہ ۲½ ہزار سال سے لیٹی ہوئی ہے ۔" بوڑھے کا لہجہ نرم ہو چکا تھا۔ "اور اب تم جا سکتے ہو۔ کوئی دوسرا سوال کئے بغیر ۔" اور یہ کہہ کر اس گمنام اور پراسرار بوڑھے عبادت گذار نے کچھ ایسی نظر ڈالی سے

[۱] فراعنہ مصر کے مقبروں سے پہلے مصریوں کی ایک مختصر آبادی کا نام ہے۔

دونوں کی طرف دیکھا کہ دونوں پر ہیبت سی طاری ہو گئی اور دونوں اُلٹے قدم واپس آگئے۔

عمارت کے باہر آ کر دونوں باپ بیٹے عالم سکوت میں ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئے اور اس پُر اسرار بوڑھے کی گفتگو اور اس کے نتائج پر غور کرتے رہے جس نے محض چند منٹ قبل ان کے حواسوں تک کو معطل کر دیا تھا۔ چند منٹ غور کرنے کے بعد عازم الدین جیسے چونک گیا۔۔۔

"وہ آخری سوال تو ابھی باقی ہے۔۔۔ اس کے جواب کے بغیر زلیخا کا مقبرہ کیسے تلاش کیا جائیگا۔" اور وہ سلیم کی طرف کوئی اشارہ کئے بغیر انتہائی تیز قدموں کے ساتھ دوبارہ مکان میں داخل ہو گیا۔۔۔

لیکن اب مکان بالکل خالی تھا۔ علیم الدین نے اس کھنڈر کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن بوڑھے بزرگ کا کوئی پتہ نہ تھا۔ مایوسی، ڈر اور خوف کے ملے جلے جذبے کے ساتھ جب وہ واپس ہوا تو اسکی نظر کاغذ کے ایک ٹکڑے پر پڑی جو ایک چھوٹے سے پتھر کے نیچے دبا ہوا تھا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے عازم نے کاغذ اُٹھایا تو اس میں لکھا تھا۔

"عازم الدین۔۔۔ میری ملاقات کا کسی سے تذکرہ نہ کرنا۔۔۔ اور نہ آج کے بعد مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرنا۔۔۔ یہ اسرار خودی ہیں ۔۔۔ تم ان کی تہہ تک نہ پہونچ سکو گے مجھے معلوم تھا تم واپس ضرور آؤ گے اور مجھ سے شہزادی زلیخا کے مقبرہ کے بارے میں ایک آخری سوال ضرور کرو گے۔

تمھارے سوال کا جواب یہ ہے کہ لکسر سے ۲۲ میل دور جب فراعنہ مصر کے کھنڈرات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تم شمال کی جانب بڑھتے جانا ـــ ۱½ میل کے بعد تمھیں ایک پہاڑی نما پتھریلا ٹیلہ ملے گا ـــ اس ٹیلہ پر چڑھو گے تو تمھیں مشرق کی جانب ایک چھوٹا سا مضبوط مقبرہ جو اہرام کی طرز پر بنا ہے دکھائی دے گا ـــ بس یہی زلیخا کا مقبرہ ہے ـــ اور اس کی پہچان یہ ہے کہ اس کی باہری فصیل کے جنوبی پھاٹک پر قدیم مصری زبان میں یہ عبارت کندہ ہے ـــ

"اس کا مقبرہ ـــ جو بیدار کی جائے گی"

اپنے لڑکے سے کہہ دینا کہ وہ دیوانگی کی حدوں کو نہ چھوئے، زلیخا کی روح بھٹک رہی ہے اور اگر اس کو عملیات یا دیگر روحانی طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تو وہ انتہائی خطرناک حرکتوں کا بھی ارتکاب کر سکتی ہے ـــ

اس کا فرض ہے کہ وہ فی الحال زلیخا کو ایک خواب ہی سمجھے ـــ حالانکہ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ زلیخا کی روح آج بھی وہاں میں موجود ہے اور شاید اسی جگہ ـــ تمھارے بالکل نزدیک ـــ جہاں تم یہ خط پڑھ رہے ہو ـــ"

عازم الدین نے گہری اور ٹھنڈی سانسوں کے ساتھ خط ختم کیا ـــ اور یہ سوچ کر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے کہ زلیخا اس کے

قریب موجود ہے — تھرتھرائی ہوئی نظروں کے ساتھ اس نے گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا — اور اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

برج کے نیچے زلیخا اپنے قدیم لباس میں موجود تھی، اس کے سنہرے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور وہ اپنی نیلی آنکھوں سے فصیل کے باہر سلیم کو دیکھ رہی تھی جو باپ کے انتظار میں بے چینی کے ساتھ ٹہل رہا تھا۔

چیخ کے ساتھ ہی زلیخا کی پرچھائیں غائب ہو گئی —

کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ وہ عازم الدین — جس نے زمانے کی سختی اور نرمی کا انتہائی بہادری سے مقابلہ کیا تھا، وہ جو مصر کے اسرار کا دیوانہ تھا — اور جو قدیم مصر کی تہذیب کا حال معلوم کرنے کے لیے اپنی جان تک دینے کے لیے تیار رہتا تھا — مکان سے باہر آیا — اور زینے پر کھڑے ہو کر ایک مرتبہ خالی برج پر اور دوسری مرتبہ فصیل کے باہر کھڑے ہوئے اپنے بیٹے سلیم پر نظر ڈالی — اور جیسے باپ کی تمام محبت، تمام شفقت اور تمام جذبات اسکی آنکھوں میں امنڈ آئے —

بوڑھے خان بہادر نے وہیں کھڑے کھڑے ایک گہری سانس لی اور زیرِ لب فیصلہ کیا —

"سلیم کی خاطر مجھے شہزادی زلیخا کی بے چین روح کو سکون دینا

ہی پڑے گا۔ میں مصر جاکر اس کا مقبرہ ضرور کھودونگا ورنہ زلیخا کی روح میرے بیٹے کو دیوانہ بنا دے گی۔"

لیکن سوال یہ تھا کہ تابوت میں سوتی ہوئی زلیخا کی زندہ ممی کو بیدار کیسے کیا جائے؟

باب ——— ۴

خان بہادر عازم الدین ایسے مصر پرست کے ذہن میں بھی نہ تھا کہ تغلق آباد کے کھنڈرات میں یہ واقعات پیش آئیں گے ——— اور اُن کی نہ صرف زلیخا سے بلکہ ایک ایسے انسان سے بھی ملاقات ہو گی جس پر انسان سے زیادہ فوق البشر اور فوق البشر سے زیادہ جن ہونیکا شبہ کیا جا سکتا ہے ———

تقریباً تین بجے رات تک وہ سو نہ سکے ——— خیالات کا ہجوم اُن کو نیند سے دُور کرتا رہا، اور وہ زلیخا، بوڑھے عبادت گزار اور سلیم کی تثلیث میں اُلجھ کر رہ گئے۔ وہ جاگتے رہے اور عالم بیداری میں زلیخا کی زندہ لاش کو دیکھتے رہے اور باہر تمام رات بارش ہوتی رہی ——— بجلی چمکتی رہی اور بادل اتنی زور سے گرجتے رہے گویا پہاڑ ا[illegible]

تو میں ایک ساتھ چلائی جا رہی ہوں۔ اور جب ان کو کوشش کے باوجود نیند نہ آئی تو وہ مسہری سے اٹھ کر آتش دان کے پاس کرسی رکھ کر بیٹھ گئے۔ اور آگ کے شعلوں کو اس طرح دیکھتے رہے۔ گویا اس آگ کے شعلوں میں بھی ان کو زلیخا کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

اسی کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ سو گئے۔ اور جب صبح ان کی آنکھ کھلی تو بارش تھم چکی تھی، ابھرتے سورج کی کرنوں کا عکس پانی میں رنگ رنگ کے بلبلوں پر رقص کر رہا تھا۔ بھیگے ہوئے درخت تمام رات کی طوفانی بارش سے ڈرے سہمے کھڑے تھے اور دور سے ان کی بہن شمیم کی آواز آ رہی تھی۔ شاید وہ اپنے کسی نوکر کو ڈانٹ رہی تھیں۔

ناشتہ سے قبل عازم الدین خلاف معمول اپنی لائبریری میں گئے اور دیر تک شہزادی زلیخا کی تصویر کو دیکھتے رہے اور سوچتے رہے حتی کہ اسی عالم میں ان کے ہونٹوں پر ایک ہیبتناک تبسم پیدا ہوا اور سگار منہ میں دبائے ناشتہ کی میز پر آ گئے۔ غالباً وہ کوئی سخت فیصلہ کر چکے تھے۔

شمیم بانو میز پر اپنے بھائی اور سلیم کا انتظار کر رہی تھی۔ لیکن جب بھائی کے آجانے کے بعد سلیم نہ آیا تو اس نے کہا "سلیم کچھ کھویا کھویا سا رہتا ہے۔ آج بھی اس نے ناشتہ میں دیر کر دی۔"

ابھی وہ یہ بات کہہ ہی رہی تھی کہ سلیم کمرہ میں داخل ہوا۔ اسکا چہرہ کسی لاش کی طرح سفید تھا، آنکھوں میں شب بیداری کے اثرات تھے،

اور بالوں کی بے ترتیبی یہ گواہی دے رہی تھی کہ جیسے وہ ابھی سو کر اٹھا ہے۔۔۔ بیٹے کی یہ حالت باپ سے چھپی نہ رہ سکی ۔۔۔ اور انھوں نے پوچھا "کیوں سلیم ۔۔۔ کیا تم رات دیر سے سوئے تھے۔"

"نہیں ڈیڈی ۔۔۔" سلیم کی آواز میں بھی مردنی تھی۔"

"کیوں ۔۔۔ ؟"

"ڈیڈی ۔۔۔ آپ یقین کریں یا نہ کریں بہرحال شہزادی زلیخا ۔۔۔ اس کوٹھی میں موجود رہی ہے۔"

" وہ کیسے ؟" ۔۔۔ گھبراہٹ میں خان بہادر کے ہاتھ سے چمچہ گر گیا۔"

"میں دس بجے رات کو ہی سو گیا تھا ۔۔۔ لیکن تیز بارش کی آواز سے اچانک میری آنکھ کھل گئی، اور جب کافی دیر تک مجھے نیند نہیں آئی تو میں نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی، سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا اندر آیا اور مجھے بارش سے دُھلی ہوئی یہ ہوا اتنی اچھی لگی کہ میں وہیں کھڑکی کے نزدیک کھڑا ہو کر سڑک کی جانب دیکھنے لگا، جو بالکل سنسان تھی اور جس پر بارش کے باوجود ایک پُر اسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی ۔۔۔

ناگاہ میں نے دیکھا کہ ایک سایہ کوٹھی کا آہنی پھاٹک کھول کر داخل ہوا ۔۔۔ پھاٹک کے نزدیک بالکل اندھیرا تھا لیکن جب یہ سایہ روشنی میں آیا تو وہ زلیخا تھی ۔۔۔ جی ہاں زلیخا ۔۔۔ جو غور سے میرے ہی کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی ۔۔۔ وہی لباس، وہی نیلی آنکھیں، ویسے ہی سنہرے بال، اور گلے میں سونے کا ویسا ہی باریک سانپ ۔۔۔ جو اس کی

تصویر میں موجود ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ ابتدا میں میں نے اس کو اپنا وہم سمجھا اور بحیثیت انسان ڈر کر اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر دی۔ چند منٹ تک حسبِ معمول بارش اور گھڑی کی ٹک ٹک کے علاوہ اور کوئی آواز نہیں سنائی دی لیکن اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی اور نامعلوم سی دستک دی جا رہی ہے۔ قریب تھا کہ میرے منہ سے ایک جگر دوز چیخ نکل جاتی لیکن میں نے دل مضبوط کر کے دروازہ کھولا کہ شاید کوئی نوکر ہی کسی ہنگامی ضرورت کی وجہ سے دستک دے رہا ہو — لیکن ڈیوڑھی راہداری میں بالکل سناٹا تھا۔

ماتھے کا پسینہ پونچھ کر میں نے دروازہ بند کیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ میں دوبارہ پلنگ پر لیٹ گیا۔ ابھی میرے خیالات میں یکسوئی آئی بھی نہ تھی کہ اچانک پھر دستک کی آواز سنائی دی — ایک بار — دو بار — تیسری بار ہلکی بالکل ہلکی جیسے دستک دینے والے کے نازک ہاتھ تھکے جا رہے ہوں — اس مرتبہ میں واقعی ڈر گیا — میری ہمت جواب دے گئی۔ رات کے پرہول سناٹے نے میرے خوف میں مزید اضافہ کیا۔ میں نے چاہا کہ میں چیخ مار کر آپ سب کو مدد کے لیے پکاروں لیکن آواز میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی — میں نے کوشش کی کہ اٹھ کر دروازہ کھولوں لیکن میرے قدم جم کر رہ گئے اور جیسے سارا بدن سن ہو گیا — مجھے نہیں معلوم کہ میری نیم بیہوشی کی یہ کیفیت کتنی دیر تک باقی رہی —

— لیکن جب میں نے اپنے حواس پر قابو پایا ۔ تو کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا — اور میرے سرہانے نیلے گلاب کا ایک پھول رکھا ہوا تھا — بالکل ویسا ہی پھول جیسا شہزادی زلیخا کی تصویر میں موجود ہے ۔

میں نے یہ پھول اپنے کانپتے اور لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اٹھانا چاہا لیکن اٹھا نہ سکا ۔ رات اسی طرح گزر گئی — اور تمام رات میں ایسا محسوس کرتا رہا جیسے کوٹھی کے باغیچے میں کوئی وجود اپنے نرم پیروں کے ساتھ چہل قدمی کر رہا ہے —"

سلیم نے یہ کہکر اپنی بند مٹھی کھولی — گلاب کا نیلا پھول اب بھی بالکل تر و تازہ تھا —

خان بہادر عازم الدین نے غور سے اس پھول کو دیکھا اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری — اور دوبارہ ناشتہ میں مصروف ہو گئے —

شمیم بانو جو غور سے بھتیجے کی آپ بیتی سن رہی تھی ناشتہ کی طرف قطعی متوجہ نہیں ہوئی — اور اس نے کہا — "میرے خیال میں سلیم پر کسی آسیب کا سایہ پڑ گیا ہے ۔"

عازم الدین نے بہن کی اس خلوص میں ڈوبی ہوئی بے معنی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور بدستور ناشتہ کرتے رہے — گویا ان کے خیال میں سلیم کی یہ سرگزشت متوقع تھی اور انھیں اس کا پہلے سے علم تھا ۔

"آج رات تم میرے کمرے میں سونا — زلیخا کے سلسلے میں کل رات

میں نے بھی ایک اہم فیصلہ کیا ہے اور کل صبح آقا مصدق طہرانی کی آمد کے بعد میں اپنا کام شروع کر دوں گا۔"

"کیا کام ؟" سلیم نے بےچین ہو کر پوچھا۔

"زلیخا کی بیداری کا کام ـــــ میں اسے بیدار کر کے رہوں گا ـــــ" عازم الدین نے مضبوط قوت ارادی کے ساتھ جواب دیا۔

"یہ زلیخا کون ہے ــ آپ کس کی بیداری کا تذکرہ کر رہے ہیں ؟" شمیم بانو نے بھائی سے سوال کیا ـــ اور بھائی نے کہا ــ "ایک شہزادی ـــــ جو سو رہی ہے ــ اور یہ میرا حکم ہے کہ آج کے بعد اس مسئلہ پر تم مجھ سے کوئی بات نہ کرنا"

بھائی کا حکم سُن کر شمیم خاموش ہو گئی، عازم الدین ناشتہ سے فارغ ہو کر چلے بھی گئے، لیکن سلیم اس طرح کرسی پر بیٹھا رہا جیسے وہ بے انتہا تھک گیا ہو،

باب ــــــ ۵

دوسرا دن اور دوسری رات خیریت سے گذری ـــ سوائے اس کے کہ سلیم کے بےچین دل کو کسی طرح قرار نہ آیا ـــ اور جب صبح آئی تو یہ صبح آغا مصدق طہرانی کی صبح تھی جو عاظم الدین کے بحری تار پر بذریعہ ہوائی جہاز صبح آٹھ بجے دہلی پہونچ رہے تھے ـــ۔

عاظم الدین اور سلیم دونوں وقت سے بیس منٹ پہلے ہوائی اڈے پہونچ گئے ٹھیک آٹھ بجے جہاز پالم کے ہوائی اڈے پر اترا ـــ اور تمام مسافر جہاز سے باہر آئے تو خان بہادر کو دور ہی سے مصدق طہرانی چہرہ دکھائی دینے لگا کیونکہ طہرانی کا قد کسی حال میں ۶½ فٹ سے کم نہ تھا ان کے خد و خال کافی دلاویز تھے، چمکدار بھورے بالوں میں نہایت خوش اسلوبی سے کنگھی کی ہوئی تھی، چہرے پر مختصر سی مونچھیں تھیں اور خفیف سی

ڈاڑھی تھی' ـــــ اور جسم پر ایرانیوں کا قومی لباس تھا،

طہرانی نے بھی عازم الدین کو دیکھتے ہی اپنا ہاتھ اٹھا کر خسروانہ انداز میں سلام کیا' ــــ اور عازم الدین کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ پھیل گئی' ــــ

کسٹم سے فارغ ہو کر جب طہرانی نے اصل عمارت میں قدم رکھا تو عازم نے دوڑ کر اس سے مصافحہ کیا اور بغل گیر ہو کر اپنے لڑکے سلیم سے اسکا تعارف کرا دیا، طہرانی نے پرخلوص دعاؤں کے ساتھ سلیم کے سر پر ہاتھ پھیرا ــــ اور ایک مرتبہ پھر خان بہادر سے خیریت دریافت کی' ــــ

"آپ کا تفصیلی بحری تار پڑھ کر میں گھبرا سا گیا اور گو مجھے بالکل فرصت نہ تھی لیکن پھر بھی میں نے اپنا فرض سمجھا کر جلد از جلد آپ کی مطلوبہ چیز دوں کے ساتھ اپنے دوست کی مدد کے لیے دہلی پہونچ جاؤں ـــ" طہرانی نے عازم الدین سے مخاطب ہو کر کہا اور سلیم یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کی آواز میں موسیقی کی سی ملاحت ہے' ــــ

"آقائے طہرانی ــــ میں کس زبان سے آپ کا شکریہ ادا کروں ــــ بہرحال آپ کوٹھی چلئے' ــــ دوپہر کے کھانے کے بعد اطمینان سے باتیں ہونگی ــــ" خان بہادر عازم الدین نے گرمجوشی سے طہرانی کا ہاتھ پکڑ کر کہا ــــ اور پھر تینوں آدمی موٹر میں بیٹھ گئے' ــــ

آقا مصدق طہرانی پیدائشی طور پر ایرانی تھے لیکن ان کی عمر کا بیشتر حصہ مصر میں گذرا تھا ــــ قدیم مصر کے اسرار معلوم کرنا ہی ان کی زندگی کا

مقصد تھا۔۔۔ مصر کی قدیم زبانوں پر ان کو عبور حاصل تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اکثر یورپ اور امریکہ بلائے جاتے تھے کہ وہ مصری مقبروں کی کھدائی میں نکلے ہوئے سنگی کتبوں کو پڑھ دیں۔ آغا مصدق حکومت مصر کی اجازت کے بعد قدیم مقبروں کی کھدائی اکثر خود بھی کرواتے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا کے اکثر عجائب خانوں میں انھیں کے فروخت کردہ مصری نوادر موجود تھے۔۔۔ خان بہادر عازم الدین کی کوٹھی بھی انھیں کی بیچی ہوئی مصری چیزوں سے سجی ہوئی تھی، اور یہ انھیں کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ عازم الدین کی کوٹھی مصری طرز تعمیر کی بنیادوں پر بنائی گئی اور اس کو اس انداز سے سجایا گیا کہ کوٹھی کے ہر گوشے سے قدیم مصر کی تاریخ و تہذیب کی بو آنے لگی۔

کوٹھی کی لائبریری میں شہزادی زلیخا کی جو تصویر موجود تھی وہ ایک مصوّر نے اس تصویر کو سامنے رکھ کر بنائی تھی جو آغا طہرانی کو چند پرانی دستاویزوں کے ساتھ مصر میں ایک قدیم مقبرہ کی کھدائی کے وقت ملی تھیں۔۔۔ اور خان بہادر عازم الدین نے اس اصلی تصویر اور تمام دستاویزوں کا از سر نو مطالعہ کرنے اور اپنے اگلے پروگرام میں طہرانی کی ہر ممکن امداد حاصل کرنے کے لیے مصدق کو طہران سے بلایا تھا۔۔۔ جہاں وہ عمر کے آخری ایام سکون سے بسر کر رہے تھے۔۔۔

دوپہر کے کھانے کے بعد عازم الدین سلیم اور طہرانی گفتگو کرنے کے لیے اس کمرہ میں بیٹھ گئے جس میں طہرانی کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ اور عازم الدین نے شروع سے اب تک کے تمام واقعات طہرانی کو سنا دیئے

"زلیخا کی روح واقعی بھٹک رہی ہے ۔۔۔ اور میں چاہتا ہوں کہ آپ کے اشتراک و تعاون سے اسکی روح کو سکون دے دوں ۔" عازم الدین نے تمام واقعات سنانے کے بعد امید بھرے لہجہ میں کہا ۔

"میرے ہندی دوست ۔۔۔ بڑھاپے نے ایک بڑی حد تک مجھے مضمحل کر دیا ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ عمر کے اس آخری دور میں کوئی سخت کام کروں لیکن اس حادثہ کی تفصیل نے خود میرا سویا ہوا شوق بیدار کر دیا ہے ۔۔۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس مہم میں آپ کو میرا ہر ممکن تعاون حاصل ہوگا ۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ رعمیس ہم[علہ] کے زمانے سے اب تک زندہ انسانوں کا مقبرہ بنانے کی تجویز کسی بنی نوع انسان کے لیے نہیں بنائی گئی ہوگی ۔" طرانی نے ٹھہر ٹھہر کر کہا ۔۔۔ اور پھر اپنا وہ چرمی سوٹ کیس کھولا جس کو وہ ہوائی جہاز سے اترتے وقت اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے تھے ، اور جس میں مصری ساخت کے چھوٹے چھوٹے قفل لگے ہوئے تھے ۔

چرمی سوٹ کیس کو انتہائی احتیاط سے کھولنے کے بعد انھوں نے ایک داغدار بوسیدہ تین فٹ لمبا چمڑہ جس کا ایک حصہ غائب تھا نکالا اور قریب کی میز پر پھیلا دیا ۔ "بس یہی وہ آخری دستاویز ہے ۔۔۔ جو زلیخا کی گمشدہ زندگی پر روشنی ڈال سکتی ہے ۔" طرانی نے یہ کہتے ہوئے دستاویز پر بنی ہوئی ایک تصویر کی طرف انگلی سے اشارہ کیا اور سلیم نے دیکھا کہ ۔۔۔ لائبریری والی تصویر ۔۔۔ اس تصویر کی ایک صاف ستھری نقل ہو

علہ رعمیس ہم ایک مشہور فرعون گذرا ہے ۔

— اس کی نگاہیں اس ہزاروں سال پرانی تصویر پر جم کر رہ گئیں۔— اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے تصویر سے جھانکنے والی شہزادی زلیخا کی آنکھیں ایک ساحرہ کی لوح کی طرح اس کو اپنے سحر سے ساکت کرتی جا رہی ہیں——۔

"بلا شبہ یہ تصویر قدیم مصری اہل فن کی مصوری کا انوکھا شاہکار ہے —۔ اور اس دستاویز میں جو بہر حال نا ممکن ہے تفصیل کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ زندہ شہزادی زلیخا کی تجہیز و تکفین کیسے کی گئی۔" طہرانی نے زیر لب ڈوبی ہوئی آواز کے ساتھ کہا۔" اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج میں اس دستاویز کا مالک ہوں۔ جو مجھے آج سے تقریباً ۲۷ سال قبل ایک مقبرہ کے کھنڈروں کی کھدائی کے وقت ایک آہنی صندوق میں موم جامہ کئے ہوئے ملی تھی۔— موم جامہ کھولتے ہی میں نے پہلی ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ کوئی عام وصیت نامہ نہیں ہے۔ جو عموماً ممی کے ساتھ دفن کر دیا جاتا تھا۔ چنانچہ میں نے دستاویز کے ان حصوں کو دواؤں کی مدد سے صاف کیا۔ جو خراب ہو گئے تھے۔— اور جب میں نے دستاویز پر لکھی ہوئی پوری کہانی پڑھ لی تو مجھے یقین ہو گیا کہ یہ دستاویز نہ صرف لاثانی بلکہ انمول ہے — کیونکہ اس پر سیتی علیہ اول کی حکومت کے آخری ایام کی تاریخ اور اس کی مہر ثبت تھی جس کی مصر میں ۱۳۱۶ قبل مسیح حکومت تھی یعنی اس طرح یہ دستاویز تقریباً تین ہزار دو سو سال پرانی ہو چکی تھی۔——

سیتی اول کے دور حکومت میں ممی بنانے کا فن اپنے عروج پر پہنچ

علہ سیتی اول بھی مصر کا ایک فرعون تھا۔ جس نے بڑی شان و شوکت سے حکومت کی تھی۔

چکا تھا، ممی بنانے کے سلسلہ میں حکماء اور فن کار روز نئے نئے تجربے کرتے تھے اور فرعون ان کی سرپرستی کرکے ان کو انعام و اکرام دیتا رہتا تھا۔ اس دستاویز میں یہ درج ہے کہ ممی بنانے کے فن کو ماہرین کے ایک گروہ نے جو خاص طور سے سیٹ اول کے حکم سے متعین کیا گیا تھا سالہا سال کے مطالعہ اور تجربوں کے بعد ایک ایسی منزل پر پہونچا دیا جو نتیجہ معلوم کیے بغیر ادھوری ہی کہی جا سکتی تھی۔ ان ماہرین کا مقصد تھا کہ وہ ایک زندہ انسان کی ممی بنائیں اور پھر اسے ایک مقررہ مدت تک زندہ بھی رکھیں۔"

دونوں باپ بیٹے طرانی کی گفتگو میں منہمک رہے اور طرانی کہتا رہا "یہ دستاویز دو حصّوں پر مشتمل ہے، پہلا حصّہ مکمل ہے اور دوسرا نا مکمل کیونکہ اسکا ایک حصہ غائب ہے، میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنا حصّہ اس میں شامل نہیں ہے لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ یہاں سے اس نے اپنی لمبی انگلی دستاویز پر رکھی "اس پھٹے ہوئے حصہ تک تقریباً تین سو برس کی داستان ضرور ختم ہو گئی جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس پر سات فرعونوں کے کاتبوں کے نام یا دستخط درج ہیں۔"

اگر میرا علم صحیح ہے اور میں نے اس کو غلط نہیں پڑھا ہے تو میرے خیال میں اس دستاویز کا پہلا مختصر حصہ سیٹ اول کے اختتام سلطنت کے آخری ایام میں لکھا گیا ہے اور اس میں یہ تفصیل بیان کی گئی ہے کہ فرعون دوران سیٹ اول کی منشا حاصل کرکے بجہیز و تکفین کے دیوتا "ایوت راع" کے ایک کاہن اعظم کی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے یہ ثابت کرنیکی کوشش

کی گئی کہ نہ صرف انسانی جسم بلکہ اسکی روح بھی مخصوص حالات میں ایک لامحدود عرصہ تک اپنی اصلی حالت میں باقی رکھی جا سکتی ہے۔"

"ایمون راع" کے اس کاہن اعظم کو یقین تھا کہ اس نے ہر وہ انتظام کر لیا ہے جو روح انسانی کی بقاء کے اس تجربہ کو کامیاب بنانے میں ممد و معاون ثابت ہو سکے۔ ــــ چنانچہ اس نے اپنے اس فلسفہ کو کامیاب بنانے کے لیے فرعون کی سرپرستی حاصل کرنا چاہی اور وہ یہ شاہانہ سرپرستی حاصل کرنے میں فتحیاب بھی ہو گیا۔ ــــ

تجربہ میں فرعون کی دلچسپیاں بڑھتی گئیں!

تراشے ہوئے خوبصورت بُت، عالیشان مقبرے، اور لافانی اہرام سیتی اول کی سطوت و شوکت کے اظہار کے لیے ناکافی خیال کیے گئے، اسلئے یہ طے پایا کہ آنے والی نسلوں اور مستقبل کی دنیا کے سامنے مصر اور فرعون مصر کی عظمت پارینہ کی تصدیق کرنے کے لیے ایک زندہ یادگار قائم ہونا چاہیئے، ــــ اور اس باعزت اور باعث افتخار یادگار کے لیے شہزادی زلیخا نے جو تناسب اعضاء، نیلی آنکھوں اور رنگ و روپ کے اعتبار سے اپنے دور کی سب سے خوبصورت شہزادی تھی خود کو پیش کر دیا۔ ــــ

دستاویز کے پہلے حصہ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ شہزادی زلیخا کو مصر کے ایک دور افتادہ علاقے "یونا" کے ایک شہزادے سے جس کا نام "احمس" تھا شدید محبت تھی، احمس اپنے دور کا ایک بہادر جنگجو افسر بھی تھا اور خود بھی زلیخا پر ملتفت تھا لیکن دیوتاؤں کو شاید محبت کا یہ رشتہ پسند نہیں آیا اور

شہزادی زلیخا کی مرضی کے بالکل خلاف اسکی منگنی "اسپاتا" نام کے ایک بزدل اور عیاش شہزادے سے کر دی گئی۔۔۔ جبکہ زلیخا کو موت منظور تھی لیکن کسی حال میں یہ پسند نہ تھا کہ اس کے دل کی دنیا میں احمس کے علاوہ کوئی اور اپنی دنیا آباد کرے۔۔۔۔

اسی اثنا میں "احمس" شمالی جنگوں میں مارا گیا اور زلیخا کی نظروں میں دنیا تاریک ہو گئی۔۔۔ احمس کی موت کے بعد زلیخا کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ وہ ہر رات کو سفید لباس پہن کر ایک ایسی فٹن میں سوار ہو کر جس میں کالے گھوڑے جتے ہوتے تھے احمس کے مقبرہ جاتی اور اس کے دروازے پر نیلے گلاب کا ایک پھول جو اس کو بیحد پسند تھا رکھ کر روتی ہوئی واپس آجاتی۔۔۔ وہ اپنی اس نامراد زندگی سے عاجز ہو کر ہر لمحہ موت کی دعا مانگتی تھی اور اس نے ایک دن سیٹی ادل کے سامنے دو زانو ہو کر "اسپاتا" سے شادی کرنے سے انکار بھی کر دیا۔۔۔

قدیم مصریوں کا عقیدہ تھا کہ اگر جسم باقی رہتا ہے تو مرنے کے بعد بھی کسی نہ کسی دن روح دوبارہ اپنے جسم میں داخل ہو گی اور مردہ ایک مرتبہ پھر زندہ ہو جائیگا بدنصیب زلیخا کو بھی اس عقیدہ پر یقین تھا چنانچہ جب اس نے سنا کہ "ایمون راع" کے کاہن اعظم کو اپنے اس تجربہ کے لیے ایک زندہ انسان کی ممی بنائے جانے اور اسکی روح کو ایک لامحدود عرصہ تک باقی رکھا جائے ایک انسانی جسم کی ضرورت ہے تو اس نے اس تجربہ کے لیے اپنے جسم کی خدمات پیش کر دی۔۔۔ تا کہ اگر تجربہ کامیاب ہو تو اس وقت تک اس کی

اسکی روح اور اس کا جسم اپنی تمامتر تازگی، شگفتگی اور جوانی کے ساتھ باقی رہے جب تک کہ دیوتاؤں کے حکم سے "احمس" کی روح دوبارہ اپنے جسم میں داخل نہ ہو جائے"۔۔۔۔

شہزادی زلیخا کو یقین تھا کہ اپنے زندہ جسم کے ساتھ ہزاروں سال کی گہری اور پُر سکون نیند کے بعد جب وہ بیدار ہو گی تو اس کی ملاقات اپنے محبوب سے ضرور ہو گی"۔۔۔۔

چند منٹ کے سکوت کے بعد طہرانی نے دوبارہ اپنا سلسلہ کلام جاری کیا "اس دستاویز میں یہ کہیں نہیں لکھا ہے کہ شہزادی زلیخا کے زندہ جسم کی ممی کس طرح بنائی گئی اور ضرورت کے وقت اس کو کس طرح بیدار کیا جائے گا۔۔۔ لیکن اس میں یہ ضرور لکھا ہے کہ جب فرعون نے زلیخا کی پیشکش قبول کر لی تو اس کے لیے نیل کے کنارے ایک خاص قسم کا زمین دوز مقبرہ بنایا گیا اور پھر کاہن اعظم کی نگرانی میں اس کو ایک سنگی تابوت میں پرسکون، گہری اور مسلسل نیند میں سلا دیا گیا۔۔۔۔

اور اس طرح سیتی اول کے دور حکومت میں اپنی نوعیت کے ایک انوکھے تجربے کا آغاز ہو گیا۔۔۔ بظاہر یہ ایک بھیانک خواب معلوم ہوتا ہے۔۔۔ طاقت اور جھوٹی خدائی کے نشہ میں چور ایک دیوانے فرعون کا خواب۔ جس نے ایک بیکس دوشیزہ کی زندگی ایک مسلسل نیند میں تبدیل کر دی۔۔۔ لیکن دستاویز کا دوسرا حصہ یہ ثابت کرتا ہے کہ سیتی اور دیوتا ایمون راع کاہن اعظم نے جو خواب دیکھا تھا اسکی تعبیر بعد کے فرعون دیکھتے رہے یعنی

زلیخا زندہ رہی اور بند آنکھوں کے ساتھ زندگی کی بھرپور سانسیں لیتی رہی ۔۔۔۔

دستاویز کے دوسرے نامکمل حصے ہیں۔ جو حالات درج ہیں ان کے بموجب ہر فرعون وقت مقررہ پر زلیخا کا مقبرہ کھول کر اس کام کے لیے متعین کاہنوں کی موجودگی میں خوابیدہ زلیخا کو جگا کر اس کی موت و حیات کا امتحان لیتا تھا اور دستاویز پر تجربہ کی کامیابی کی مہر لگا کر دوبارہ مقبرہ بند کر دیتا تھا ۔۔۔ سیتی اول کی وصیت کے بموجب ہر پچاس برس کے بعد یہ امتحان ضروری تھا، چنانچہ دستاویز بتاتی ہے کہ مقبرہ کا دروازہ سات مرتبہ کھولا گیا اور اس کے ثبوت میں اس پر سات فرعونوں کی دستخط موجود ہیں ۔۔۔۔

سیتی اول نے زلیخا کے سنگی تابوت کے قریب وہ تمام دوائیں رکھدی تھیں جن سے زلیخا کو بیدار کیا جا سکتا تھا اور ایک چکنے پتھر پر جگانے کا طریق کار کندہ کرا دیا تھا ۔۔۔ ایک کے بعد ایک سات فرعون اس پر عمل کر کے زلیخا کی ناقابل یقین نیند سے بیداری اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے اور دستاویز پر نتیجہ کا اندراج کرتے رہے ۔۔۔ یہ اندراج اسی رنگ سے کیا جاتا تھا۔ جو اس فرعون کا قومی اور سرکاری رنگ[1] ہوتا تھا چنانچہ دستاویز میں واقعی سات رنگ موجود ہیں ۔۔۔ فرعون کے علاوہ کاہن اعظم بھی تصدیق کے لیے

---

[1] قدیم مصری تاریخ بتاتی ہے کہ ہر فرعون اپنے دور حکومت کا ایک سرکاری رنگ مقرر کرتا تھا۔ فوج کی وردی اسی رنگ کی ہوتی تھی، شاہی خاندان کا بالائی لباس اسی رنگ کا ہوتا تھا اور اسی رنگ کی روشنائی سے لکھا جاتا تھا ۔۔۔

دستخط کرتا تھا اور ایک الگ حاشیہ پر اپنے تاثرات بیان کر دیتا تھا۔۔۔۔ دشاویز کی صداقت، کا ایک یہ بھی ثبوت ہے کہ ہر کاہن اعظم کا خط ایک دوسرے سے مختلف ہے۔۔۔۔

مجھے نہیں معلوم کہ دستاویز کا جو حصہ ضائع ہو چکا ہے اس میں کیا تحریر تھا اور بعد کے کیا واقعات بیان کئے گئے تھے لیکن ساتویں فرعون نے خود اس میں اپنے ہاتھوں سے مہر لگانے کے بعد یہ لکھا ہے کہ "تادم تحریر شہزادی زلیخا زندہ ہے۔"

طراؔنی نے مزید کہا۔۔۔ آج سے ۲۷ سال قبل جب میں مصر میں تھا اور آج بھی جبکہ میں مصر اور اس کے اسرار سے سینکڑوں میل دور ہوں مجھے یقین تھا اور ہے کہ یہ دستاویز اور اس میں بیان کردہ تفصیل موجودہ دنیا کی حکمت سرحدی، اور سائنس کو باطل ثابت کر سکتی ہے بشرطیکہ زلیخا کا مقبرہ دریافت کر لیا جائے۔۔۔۔ میں ہمیشہ سے قدیم مصری تہذیب کا دیوانہ تھا چنانچہ میں مصر کے اس اسرار کا پرچم ساری دنیا پر لہرانے کے لیے زلیخا کا مقبرہ تلاش کرتا رہا۔۔۔ اور مسلسل پانچ سال تک وادی نیل میں گھومتا رہا کہ شاید مجھے یہ مقبرہ مل جائے اور میں سیٹھی اول کی ہدایت پر عمل کر کے اس زلیخا کو نیند سے بیدار کر دوں۔ جو تقریباً ۳½ ہزار سال سے اپنے تابوت میں سو رہی ہے اور اس کی منتظر ہے کہ وہ جاگے اور جاگ کر اپنے محبوب احمس سے ملاقات کرے۔۔۔ لیکن انتھک کوشش کے باوجود میں مقبرہ کی تلاش میں ناکام رہا۔۔۔۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے پورا یقین ہے کہ شہزادی زلیخا کا زندہ جسم آج بھی اپنے زمین دوز مقبرہ کے سنگی تابوت میں سو رہا ہے۔ لیکن اب شاید بدنصیب شہزادی کی روح اپنے جسم کی بیداری کے لیے بے چین ہو گئی ہے۔۔۔ شاید اس لیے کہ اسکی بھٹکتی ہوئی روح نے اپنی محبت کے مرکز "احمس" کو دنیا کے کسی گوشے میں کسی اور نام یا کسی اور قالب میں دیکھ لیا ہو۔۔۔ اور وہ اپنے محبوب سے اس ملاقات کے لیے جس کی خاطر اس نے ایک خطرناک تجربہ کے لیے اپنے جسم کا پیش کش کی تھی بے چین ہو گئی ہو۔۔۔ شہزادی کی روح جانتی ہے کہ جسم کے بغیر روح بیکار ہے اور شاید اسی لیے اسکی روح کو اپنے اس زندہ جسم کی ضرورت محسوس ہو رہی ہو۔۔۔ جو اپنے تابوت میں سو رہا ہے۔۔۔

شدت جذبات سے طہرانی کی آواز بھرا گئی۔۔۔ وہ چند منٹ تک بالکل خاموش رہا اور اپنی نم آنکھوں سے اس دستاویز کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے اس دستاویز کو اسی طرح طے کر کے چرمی سوٹ کیس میں رکھا اور کہا۔۔۔ "دوست عازم الدین۔۔۔ تمھارے دل پر کچھ بھی بیتے اور تمھیں کتنا ہی صدمہ کیوں نہ ہو۔۔۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ زلیخا کا محبوب شہزادہ احمس۔۔۔ تمھارا بیٹا سلیم ہی ہے۔۔۔ ورنہ زلیخا کی روح دہلی کو اپنا مرکز نہ بناتی۔۔۔ رات کی تاریکی میں اس کی روح تمھاری کوٹھی کے مختلف کمروں میں نہ بھٹکتی اور سلیم کی خوابگاہ میں داخل ہو کر نیم بیہوش سلیم کے سرہانے نیلے گلاب کا پھول نہ رکھتی۔۔۔

میں نہیں جانتا کہ تمھارے بیان کے بموجب تغلق آباد کے کھنڈروں میں تم سے ملاقات کرنے والا وہ بزرگ کون تھا ۔۔۔۔ لیکن زلیخا کے بارے میں اس کے انکشافات اور پھر تمھارے نام اس کے خط میں زلیخا کے مقبرہ کا مکمل پتہ یہ ضرور ثابت کرتا ہے کہ وہ فوق البشر ضرور تھا ۔۔۔ اور وہ خود چاہتا ہے کہ زلیخا کو مسلسل نیند کی قید سے نجات مل جائے ۔۔۔

"اس لیئے آؤ میرے دوست ۔۔۔ ہم دونوں مل کر زلیخا کا مقبرہ تلاش کریں اس کو اس کی نیند سے بیدار کریں اور ایک عورت کو اس کے محبوب سے ملادیں ۔۔"

عازم الدین اور سلیم دونوں پر سکتہ طاری تھا ، طہرانی کی اس لمبی گفتگو اور جذباتی خواہش کے اظہار کے بعد بھی دونوں کئی منٹ تک خاموش رہے ۔۔ ایک مرتبہ پھر عازم الدین کے چہرے پر شاداب مسکراہٹ پھیلی اور اس نے سلیم کی طرف دیکھتے ہوئے طہرانی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا ۔۔

"میرے ایرانی دوست ۔۔ میں خود زلیخا کے مقبرہ کی تلاش میں تمھاری مدد چاہتا تھا اور اسی لیئے سابقہ تعلقات کے پیش نظر میں نے تمھیں تار بھیجکر یہاں بلوالیا ۔۔۔ لیکن سلیم کے قالب میں زلیخا کے محبوب شہزادے احمس کی روح موجود ہے یہ میں ماننے کے لیئے تیار نہیں ۔۔۔ اس لیئے کہ میں آواگون کا قائل ہی نہیں ۔۔۔"

"میں مہم کی افادیت اور اس کے مقاصد کے پیش نظر تم سے مسئلہ تناسخ پر کوئی بحث کرنا بھی نہیں چاہتا ۔۔۔ کیونکہ میں خود اس کا قائل نہیں ہوں

لیکن تم دیکھ لینا کہ اگر ہمیں زلیخا کا تابوت مل گیا اور ہم اس کو برآمد کرنے میں کامیاب ہو گئے تو سلیم ہی احمس ثابت ہو گا۔" طہرانی نے پورے یقین کے ساتھ کہا "خیر" طہرانی نے کچھ توقف کے بعد عازم الدین سے کہا "تمھارا آخری فیصلہ کیا ہے؟"

"ہم تینوں آدمی اردن اسپتال کے ڈاکٹر بیگ کے ہمراہ اگلے ہفتہ مصر کے لیے روانہ ہو جائیں گے ــــ آج سے زلیخا کے تابوت کی تلاش ہی میرا مقصدِ حیات ہے ــــ"

اور عازم الدین کے اس جملہ نے جیسے کمرے کی پرسکون فضا ہی بدل دی

باب ـــــــ ٦

تین دن تک کوٹھی میں کوئی قابل ذکر حادثہ نہیں ہوا۔ عازم الدین سرگرمی سے مصر کے سفر کی تیاریوں میں مصروف رہے، اور انھوں نے کافی بحث و مباحثہ کے بعد ڈاکٹر بیگ کو بھی سفر میں شریک ہونے کے لیے رضامند کرلیا۔۔۔ ڈاکٹر بیگ کا کہنا تھا کہ زلیخا اور اسکی روح کا "قصہ" ایک جھوٹی اور بے بنیاد کہانی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا وہ سفر میں جانے کے لیے بالکل تیار نہ تھے لیکن عازم الدین کی ضد کے آگے آخر کار انھیں سر تسلیم خم کرنا ہی پڑا، اور انھوں نے بھی تین ماہ کی چھٹی لیکر سفر کی تیاریاں شروع کردیں۔۔۔۔

دھیرے دھیرے عازم الدین کے حلقۂ احباب میں یہ خبر پھیل گئی کہ وہ کسی اہم مہم پر مصر جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں، چنانچہ ایک دن ان کے

دو دوست جن میں ایک فلسفہ اور ریاضی کا پروفیسر ارشد تھا اور دوسرا علم کیمیا و دہیئت کا ماہر احمد ریاض تھا ان سے الوداعی ملاقات کرنے کے لیے کوٹھی آئے — جہاں عازم الدین نے ان کا تعارف اپنے ایرانی دوست طہرانی سے بھی کرایا — اور اس طرح ڈاکٹر بیگ کی موجودگی میں سفر کی نوعیت پر ایک دلچسپ گفتگو شروع ہو گئی —

"کیا آپ کو بالکل یقین ہے کہ آپ کو اپنے مقصد میں کامیابی ہو گی اور آپ زلیخا کا زندہ جسم حاصل کر کے اس کو بیدار کر لیں گے" پروفیسر ارشد نے سگار کا دھواں منہ سے چھوڑتے ہوئے کہا —

"ہاں — مجھے پورا یقین ہے —" عازم الدین کے بجائے مصدق طہرانی نے جواب دیا۔

"لیکن مجھے نہیں ہے —" پروفیسر ارشد نے گردن ہلا کر کہا۔

"یقین نہ ہونے کا سبب"— عازم الدین نے سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں اس کہانی کو ہی جھوٹا سمجھتا ہوں —" پروفیسر ارشد نے منہ بنا کر کہا اور — پروفیسر کے اس روکھے جواب سے کمرہ کی فضاء مکدر کر دی —

پروفیسر عام حالات میں بھی بے حد خشک مزاج اور کم گو تھا — وہ صرف ان مسائل پر گفتگو کرنے میں جوش دکھاتا تھا جس میں خود اس کو دلچسپی ہو اور اسی لیے اس کے احباب اس کی باتوں کا برا نہیں مانتے تھے — لیکن طہرانی — وہ اس کے دوستوں میں تو نہ تھا؟

احمد ریاض ایک دراز قامت وجیہہ اور خوش گفتار بوڑھا تھا جس میں خداداد صلاحیتیں موجود تھیں، جسمانی اعتبار سے وہ گول مول قسم کا انسان تھا، جس کا چہرہ سرخ، سر ضرورت سے زیادہ بڑا اور بال بالکل بھورے تھے۔۔۔

اور ان سب کے برعکس طہرانی کی خوش مزاجی یا بد مزاجی کا دیکھنے والوں کو پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔۔۔ اس محفل میں وہ سب سے زیادہ دانا اور سب سے زیادہ تجربہ کار تھا، دنیا کے مہذب یا غیر مہذب بہت کم ایسے ملک ہوں گے جہاں کی سیاحت اس نے نہ کی ہو۔۔۔ حد یہ کہ وہ ایمیزن کے جنگلات بھی دیکھ چکا تھا اور تبت کے پُر اسرار دیہات بھی۔۔۔ اس کو یہ ارشد کا یہ جواب برا تو بہت لگا لیکن پھر بھی مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

ادھر عازم الدین اپنے دوستوں کے ساتھ اپنے مجوزہ سفر کی تفصیل اور اس کی نوعیت پر تبادلۂ خیالات کر رہے تھے اور ادھر سلیم اپنی بےچینیوں کو دل کی گہرائیوں میں دبائے کوٹھی کی چھت پر بلا مقصد ٹہل رہا تھا۔۔۔

جاوید کی کوٹھی جس کا نام خان بہادر عازم الدین نے اپنے شوق کی عکاسی کرنے کے لیے "عروس نیل" رکھا تھا کشمیری دروازے کے باہر ایک کھلی ہوئی جگہ پر تھی اور وہ اس وقت عمارت کی سب سے اونچی چھت پر تھا جہاں سے پوری آبادی صاف دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ سکون میں ڈوبی ہوئی آبادی کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔۔۔ چھت پر کھڑے ہی کھڑے اس نے باغ کے اس گوشے پر نگاہ ڈالی جہاں ایک رات زلیخا اسے دکھائی دی تھی۔۔۔ لیکن

اس وقت اسے خارہ دار انگور کی بیلوں اور پھولوں سے لدے ہوئے پودوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آیا۔۔۔ چنانچہ جب یہاں بھی اسے کوئی سکون نہ ملا تو وہ لائبریری چلا گیا کہ کچھ دیر شہزادی کی تصویر ہی دیکھ کر اپنا دل بہلائے ۔۔۔ دیر تک وہ اس خاموش، ساکت اور پُر اسرار تصویر کو دیکھتا رہا ۔۔۔ اس تصویر میں بنی ہوئی سمندر سے زیادہ گہری نیلی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔۔۔ اور ان سنہرے بالوں کو دیکھتا رہا جو اس کے دل کی دھڑکنوں کے چاروں طرف ایک حصار سا کھینچ چکے تھے۔۔۔

اور جب اس کا دل یہاں بھی نہیں لگا تو وہ اس کمرے میں چلا آیا جہاں اس کے والد کے پانچوں قریبی دوست مصر کے سفر پر ایک تلخ گفتگو کر رہے تھے۔۔۔ خان بہادر عازم الدین نے اس کمرے کو بھی خاص طور سے سجوایا تھا۔ الماریوں میں طرز کہنہ کے ظروف رکھے گئے تھے اور گلدانوں میں پھولوں کے بجائے خوبصورت تراشے ہوئے مصری بُت ۔۔۔ پورا کمرہ آثار قدیمہ کی کی چیزوں سے مکمل طور پر آراستہ تھا، حد یہ کہ فرنیچر بھی قدیم طرز تھا۔۔۔

پانچوں دوست انتہائی گرمجوشی سے گفتگو کرنے میں منہمک تھے کہ سلیم دروازہ کھول کر عین اس وقت داخل ہوا جب مصدق ایرانی کہہ رہا تھا "میرے معزز دوستو! اب تک کی زبردست بحث کے بعد بہر حال میں یہ ثابت کر چکا ہوں کہ یہ دستاویز اصلی ہے اور اس میں بیان کردہ واقعات تاریخی حقائق پر مبنی ہیں۔۔۔ میں ایک مرتبہ پھر کہتا ہوں کہ دستاویز کی صداقت ہر صورت میں ناقابلِ تردید ہے ۔۔۔ اور ہماری مہم کا

مقصد صرف یہ ہے کہ ہم دستاویز میں لکھے ہوئے دعووں کی اصلیت معلوم کریں۔ یعنی زلیخا کا مقبرہ کھود کر اس کا تابوت حاصل کریں اور پھر یہ دیکھیں کہ ہزاروں سال سے سونے والی شہزادی بیدار کی جا سکتی ہے یا نہیں ؟

"میں آپ سے متفق ہوں" احمد ریاض نے پرسکون انداز میں جواب دیا۔ "میں نے خود اکثر کتابوں میں پڑھا ہے کہ سیسٹی اول کے دور میں ممی بنانے کے فن نے بے انتہا ترقی کی تھی اس لیے کیا عجب ہے کہ اس فرعون نے کسی زندہ انسان کی ممی بنانے کی اسکیم بنائی ہو اور اس کے لیے شہزادی زلیخا کا ہی انتخاب کیا ہو۔۔۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ سیسٹی اول اپنے ہر فعل کو مذہبی حیثیت دیتا تھا۔۔۔ اور خدا بننے کا جنون اس کے دماغ میں اس حد تک سما گیا تھا کہ اس نے خود کو "ایبس" دیوتا مشہور کر کے اپنی پرستش شروع کروا دی تھی۔"

"چلیے ۔۔۔ میں مانے لیتا ہوں" پروفیسر ارشد نے بجھے ہوئے لہجے میں کہا "کہ دستاویز میں جو حقائق بیان کیے گئے ہیں وہ تاریخی اعتبار سے صداقت پر مبنی ہیں لیکن میں چاہوں گا کہ ڈاکٹر بیگ دستاویز میں لکھے ہوئے اس دعوے پر اپنی رائے ظاہر کریں کہ شہزادی زلیخا کو بیدار کیا جا سکتا ہے کیونکہ اسکا تعلق علم عضویات سے ہے۔"

ڈاکٹر بیگ نے جو اب تک اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا اپنی عینک کے موٹے شیشوں سے جھانک کر استفہامیہ نظروں سے چاروں طرف دیکھ کر کہا۔ "میں فوراً کسی نتیجہ پر نہیں پہونچ سکتا۔۔۔ لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں

زندگی یعنی روح ۔۔۔ بیہوشی کی حالت میں ایسی صورت میں اختیار کر لیتی ہے جس کے متعلق سائنس تاریکی میں ہے ۔۔۔ مشہور سائنسداں اگسٹ ویسمین نے اس مسئلہ پر جہاں تک روشنی ڈالی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روح کے نعل کے لیے جسم کے خارجی حالت کی درستگی اشد ضروری ہے ۔۔۔ مطلب یہ کہ میری رائے میں جو بالکل ذاتی ہے اس دستاویز کا دعویٰ بالکل باطل ثابت ہوگا۔"

"گویا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر شے کے نعل کے لیے اس کی تازگی اور خارجی حالات کی صحت مندی ضروری ہے۔" طہرانی نے مداخلت کی۔

"ہاں ۔۔۔ اور اس اصول کا اطلاق صرف جسم انسانی پر نہیں ۔۔۔ پودوں اور غلوں کے بیجوں تک پر ہے ۔۔۔" ڈاکٹر بیگ نے اپنے الجھے ہوئے بالوں کو درست کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں نے ایک مرتبہ ایک مقبرے میں سے فرعون کی چودھویں نسل کے زمانے کے گندم کے بیج حاصل کر کے بوئے تھے ۔۔۔ اور ۔۔۔" طہرانی نے کہا۔

"تو کیا ان سے کوئی فصل پیدا ہوئی ۔۔۔" ڈاکٹر نے طہرانی کا جملہ مکمل نہیں ہونے دیا۔

"نہیں ۔۔۔ لیکن اس کے پودے ۹ انچ تک بڑھے اور پھر مرجھا گئے ۔۔۔" طہرانی کچھ اور کہتا لیکن ڈاکٹر بیگ نے آہستہ آواز میں کہنا شروع کیا ۔۔۔ "تو ان بیجوں میں زندگی کی رمق ضرور موجود تھی ۔۔۔ جو مستور تھی

لیکن تھی ضرور۔۔۔ اس قسم کی مثالیں اور بھی ہیں۔۔۔ مثلاً ایک سانپ کو عرصۂ گذشتہ کے چند مشہور و معروف حکماء نے ایک چٹان میں قید کر دیا تھا اور یہ سانپ کئی سو برس تک زندہ رہا۔۔۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے کشمیر میں ایک سادھو دیکھا تھا۔ جو اپنی روح کو جسم سے علیحدہ کرنے کا دعویٰ کرتا تھا اور مہینوں بلا کچھ کھائے پیئے زندہ رہتا تھا۔۔۔ لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ کیا گوشت پوست کے ریشے ۳½ ہزار برس تک جیسا کہ دستاویز میں لکھا ہوا ہے صحیح سلامت رہ سکتے ہیں۔۔۔"

"اگر دستاویز کی تحریر کے بموجب تین سو سال تک سلامت رہ سکتے ہیں تو ۳½ ہزار سال تک بھی باقی رہ سکتے ہیں۔۔۔" طہرانی نے فوراً کہا۔

"خیر۔۔۔ میں ہر بات مانے لیتا ہوں لیکن یہ کیسے مان لوں کہ کسی زندہ انسان کی ممی بنائی جا سکتی ہے جبکہ ممی بنانے کے لیے انسانی لاش کو مہینوں نمک اور شورے کے حوض میں ڈال دیا جاتا تھا۔۔۔ اور یہ بالکل ناممکن ہے کہ ایک زندہ انسان پر وہ عمل کیا جائے۔ جو ممی بنانے کے لیے ایک لاش پر کیا جاتا تھا۔۔۔ میں نے اپنی آنکھوں سے لاتعداد ممیاں دیکھی ہیں۔۔۔ اور اسی بناء پر میں یہ بات پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں۔۔۔" پروفیسر ارشد نے گردن کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

"اگر آپ دستاویز کی صداقت مانتے ہیں تو پھر اس پر بھی یقین لائیے

کہ فرعون مصر سیتی اوّل کے حکماء اور کاہنوں نے نہ صرف زندہ انسانوں کی ممی بنانے کا بلکہ روح کی واپسی کا بھی کوئی نہ کوئی طریقہ ضرور معلوم کر لیا ہو گا ورنہ زلیخا کو ۳۰۰ سو برس تک سات مرتبہ بیدار نہ کرتے اور دوبارہ نہ سلاپاتے ۔“

اور طہرانی کے اس جواب نے تقریباً سب کو خاموش کر دیا ۔

چند منٹ کی خاموشی کے بعد پروفیسر ارشد اور احمد ریاض دونوں نے بالکل اچانک متفقہ طور پر یہ اعلان کر دیا کہ وہ بھی اس مہم میں شریک ہو رہے ہیں اور خان بہادر عاصم الدین کے ساتھ مصر جانے کے لیے تیار ہیں ۔ گویا اس طرح اب اس مہم میں چھ آدمی شریک ہو گئے ۔ تمام اخراجات کی ذمہ داری خان بہادر نے اپنے ذمہ لے لی ۔

اور سیّاح صفت طہرانی کی خوشی و مسرت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا ۔ اسکی برسوں پرانی قدیم آرزو پوری ہونے جا رہی تھی اور اپنی جوانی کے انتہائی رنگیلے اور مسکراتے دنوں میں اس نے مصر کی قدیم ترین تہذیب اور اس کے انتہائی اہم اسرار کا پردہ اٹھنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ پورا ہو رہا تھا ۔ طہرانی کی بوڑھی چھاتی میں زندہ رہنے کی ایک بھرپور امنگ نے انگڑائی لی ، آنکھوں میں نوجوانی کی وہ چمک جس کو بڑھاپے نے ماند کر دیا تھا ایک مرتبہ پھر عود کر آئی ۔ اور بالکل غیر ارادی طور پر ایک فاتح مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیل گئی ۔

ادھر سلیم بھی سوچ رہا تھا ۔ آخر کار وہ وقت آ ہی گیا جب میں

زلیخا کو مجسم نیند بنے ہوئے یا بیداری کی انگڑائی لیئے ہوئے دیکھ سکونگا۔

ایک ہفتہ کے بعد یہ قافلہ دہلی سے بمبئی کے لیئے روانہ ہوگیا ۔۔۔ یہ ایک ہفتہ آلات حرب، کھدائی کے اوزار اور سفر کے دوسرے سامان کی خرید و فروخت میں انتہائی جوش و خروش سے گذرا، اور کوئی قابل ذکر بات نہیں ہوئی ۔۔۔

عازم الدین کی بہن شمیم بانو نے بھی پارٹی میں شامل ہونے کی ضد کی لیکن کوٹھی کی حفاظت کے خیال سے انھیں چھوڑ دیا گیا ۔۔۔ اور وہ نہ جاسکیں۔

قاہرہ جانے والا جہاز بمبئی کے بندرگاہ سے گیارہ بجے رات کو روانہ ہونے والا تھا اس لیئے پارٹی کے افراد نو بجے تک بندرگاہ پہونچ گئے اور جہاز پر سامان پہونچا دیا گیا ۔۔۔ اب سب کی منزل ایک ہی تھی یعنی قاہرہ ۔۔۔ اچانک سلیم کی نظریں جہاز کے عرشہ پر پڑیں اور وہ بت کی طرح ساکت رہ گیا ۔۔۔

زلیخا جہاز کے عرشہ پر موجود تھی اور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک ہی منٹ کے بعد وہ دیوانہ وار جہاز کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگا ۔۔۔ لیکن قبل اس کے کہ اوپر پہونچتا ایک آدمی سے اسکی ٹکر ہوگئی اور وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آرہا ۔۔۔

عازم الدین اور اس کی پارٹی کے کسی بھی آدمی کی سمجھ ہی میں نہیں آیا کہ یہ سب کیسے ہوا؟ اور کیوں ہوا؟ چنانچہ جب سلیم نے انھیں

بتایا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے زلیخا کو جہاز کے عرشے پر دیکھا ہے تو
تو طہرانی کے علاوہ ہر شخص لرز کے رہ گیا۔
طہرانی بہر حال پرسکون تھا ــــــ!!!

باب ـــــ ۷

بارہ دن کے بحری سفر کے بعد عازم الدین کی پارٹی قاہرہ پہونچ گئی۔ جہاں انھوں نے شیفرڈ ہوٹل میں اپنی قیام کا بندوبست کیا ـــ جو قلب شہر میں تھا اور جس کی بالکونی سے شہر کی کئی سڑکیں اور بازاریں دکھائی دیتی تھیں۔

عازم الدین اور پارٹی کے دوسرے لوگ لکسر جانے کی تیاریوں میں ارد گرد کھدائی کے عملہ تلاش کرنے میں مصروف رہتے تھے اور سلیم قاہرہ کی بازاروں اور مصر کے حسن میں مدہوش رہتا تھا۔ تمام دن وہ سڑکوں پر گھومتا ـــ سامان سے لدے ہوئے اونٹوں کو دیکھتا، بازاروں کی گہما گہمی دیکھتا ـــ اور ان برقع پوش خواتین کو دیکھتا جن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہر شخص کے دل میں ہیجان پیدا کرنے کے لیے کافی تھیں۔

لیکن اسے تو اُن نیلی آنکھوں کی تلاش تھی ــــ جو اس کے قلب کا سارا سکون درہم برہم کر چکی تھیں ــــ اور جس نے ایک بہت بڑی حد تک اسے مخبوط الحواس بنا کے رکھ دیا تھا ــــ وہ اکثر سوچتا کیا مصر کا سفر اس کے تاریک خوابوں میں امید کی شعاعیں پیدا کر سکتا ہے ــــ؟ وہ قاہرہ کے مشہور عجائب گھر بھی گیا جہاں سیٹی اول کی ممی ایک تابوت میں رکھی ہوئی تھی ــــ اور جس کی شکل دیکھ کر یقین ہی نہیں آتا تھا کہ یہ وہی قدیم تہذیب مصر کا جلیل القدر حکمران ہے جس نے مصر کو ایک تہذیب و تمدن کی معراج پر اس وقت پہونچا دیا تھا جب یورپ وحشی انسانوں کا مسکن تھا اور امریکہ میں صرف کوہ، صحرا، دریا اور دلدلیں تھیں ــــ وہ سیٹی اول کی ممی کو دیر تک دیکھتا اور سوچتا رہا کہ یہ وہی سیٹی اول ہے جس کی خداداد فہم و ادراک کی داستانیں آجتک باقی ہیں ــــ جس نے شہزادی زلیخا کے زندہ جسم پر تاریخ انسانی کا ایک عبرتناک تجربہ کیا ہے ــــ جس کے لبوں نے اس کے خوابوں کی حسینہ سے باتیں کی ہیں اور جس کی آنکھوں نے ان نیلی آنکھوں کو دیکھا ہے جو اس پر سحر طاری کر چکی ہیں ــــ

سیٹی اول کی ممی کے قریب کھڑے ہی کھڑے جیسے سلیم نے عالم تصور میں زلیخا کو دیکھ لیا ــــ زلیخا کو ــــ اتنی حسین اور نازک جیسے گلاب کا تازہ کھلا ہوا پھول، تیکھے نقوش، گورے گالوں پر جھکی ہوئی سیاہ لانبی آنکھیں ــــ نیلی آنکھوں میں شباب کی مستی ــــ ایک ایسا نسوانی مجسمہ جس میں حسن و شباب کی تمام رعنائیاں موجود ہوں ــــ بس ــــ

سیٹی اول نے جس زلیخا سے گفتگو کی ہو گی وہ ایسی ہی ہو گی اور سلیم کے لبوں سے ایک آہ نکل گئی۔

شام کو پارٹی کے تمام افراد ایک جگہ جمع ہوئے۔ فیصلہ یہ ہونا تھا کہ یہاں سے کس دن کوچ کیا جائے۔ اور صرف طہرانی کا انتظار تھا جو ایک معتبر گائڈ کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ تقریباً آٹھ بجے طہرانی بھی ایک آدمی کے ساتھ ہوٹل پہونچ گیا۔ طہرانی کا چہرہ دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ تمام دن دوڑ دھوپ کرتا رہا ہے، اس کا سفید رنگ گرمی کی تمازت سے جھلس کے رہ گیا تھا اور عقاب نما آنکھوں میں انتہائی تھکن کے آثار تھے۔ عازم الدین نے طہرانی کے ساتھ آنے والے نووارد مصری کو متجسس نگاہوں سے دیکھا۔ جس کے چھریرے بدن پر سفید دستار وسیاہ لباس اس کو ایک سچا مصری ثابت کر رہا تھا، جس کی آنکھوں سے معصومیت ٹپک رہی تھی اور جو اپنے آبنوسی عصاء کے ساتھ ایک عبادت گزار مصری معلوم ہوتا تھا۔

طہرانی نے سب سے علیک سلیک کرنے کے بعد کہا۔ "اب میں آپ کا تعارف اپنی مہم کے ایک نئے ممبر حسن اصغر سے کراتا ہوں۔ جو وادی شاہان مصر کے بارے میں وہ سب کچھ جانتے ہیں۔ جو میں نہیں جانتا ۔ میں نے ان کو راضی کر لیا ہے کہ یہ خوابیدہ شہزادی کی خوابگاہ تک ہماری رہبری کریں گے۔ انھیں کی وساطت سے میں نے ایسے پندرہ مزدوروں کا بھی انتظام کر لیا ہے۔ جو خاموشی اور رازداری کے ساتھ

مقبرہ کی کھدائی کریں گے اور ہم سے ایک دن پہلے لکسر روانہ ہو جائینگے۔"

حسن اصغر نے سب کو باری باری سلام کیا اور اجازت لے کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

طہرانی نے پھر کہا۔ "حسن اصغر اپنے علم کے اعتبار سے قدیم مصر اور اس کے کھنڈرات میں پھیلے ہوئے رازوں کا مخزن ہے۔ پورا مصر اس سے واقف ہے اور مصر کے حکام تک انکی عزت کرتے ہیں۔ انکی شرکت اس لیے اور بھی زیادہ مفید ہے کہ ہمیں کھدائی کا کام اپنا مقصد بتائے بغیر حکومت مصر کی نگاہوں سے چھپ کر کرنا ہے اور حسن اصغر اس پر راضی ہو گئے ہیں کہ وہ اس حیرتناک مہم کے بارے میں حکومت مصر کو نہ صرف بالکل تاریکی میں رکھیں گے بلکہ اگر کوئی ناخوشگوار بات ہوئی تو وہ تمام ذمہ داری اپنے سر اوڑھ لیں گے۔"

"خدا کی قسم۔ طہرانی۔ اس مہم کی کامیابی کے لیے ہمیں ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ کیونکہ اگر حکومت مصر کو ہماری مقاصد یا اسکیم کی تفصیل کا علم ہو گیا تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔" عازم الدین نے شکریہ کے انداز میں کہا۔

"رازداری کے ساتھ ہی کامیابی ممکن ہے۔" احمد ریاض نے کہا۔

"اور یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ شہزادی زلیخا کے مقبرہ کی تلاش میں ہمیں زیادہ دقت نہیں اٹھانا پڑے گی کیونکہ عازم الدین صاحب کو ایک پر اسرار بزرگ کے ذریعہ مقبرہ کی شناخت اور پورا پتہ معلوم ہو چکا ہے

ـــ ماسوا اس کے وادیٔ زعون میں بیشمار مقبرے ہیں کیونکہ اگر وہاں صرف شہزادی کا مقبرہ ہوتا تو ہماری آمد و رفت مشکوک سمجھی جاتی ـــ جہاں تک میرا اندازہ ہے یہ مقبرہ بیگمات کے مقبروں کے شمال میں اور مغربی گھاٹی کے کنارے پر بادشاہوں کے مقبروں سے نصف میل چلنے کے بعد ایک پہاڑی کی آڑ میں واقع ہے ـــ اور سیاح زیادہ سے زیادہ ملکہ نیفرتاری، ملکہ سیست، رامسس یا سیٹی اول کی محبوب ملکہ کے مقبروں تک جاتے ہیں اور اس کے بعد واپس لوٹ آتے ہیں ـــ گویا اس طرح ہم سیّاحوں کی نظر سے بھی محفوظ رہیں گے ـــ طہرانی نے سفر پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا "اپنے سفر اور اپنی مجوزہ مہم کو چھپانے کے لیے میں نے یہ بھی بندوبست کر لیا ہے کہ کھدائی کرنے والے مزدور ہم سے وادیٔ زعون سے سات میل دور "زشت" سے قرنا جانے والی سڑک پر مل جائیں گے۔ یہ میں نے اس لیے کیا کہ نزدیک ہی "حوارہ" نام کا ایک گاؤں ہے اور وہاں کا شیخ میرا دوست ہے"

"پھر اب روانگی میں کیا دیر ہے" سلیم نے بے چینی سے پوچھا۔

"بس کل صبح ہم یہاں سے روانہ ہو جائیں گے" ـــ طہرانی نے فیصلہ کن انداز میں کہا ـــ اور سب کے چہرے پر خوشی پھیل گئی۔

سلیم سب سے زیادہ مسرور تھا ـــ قاہرہ کے قیام کے دوران میں وہ اہرام مصر اور ابوالہول دیکھ چکا تھا، شہر کے جادو بھرے بازاروں اور گلیوں میں گھوم چکا تھا ـــ مصر کی فضاؤں سے اسے محبت ہو چکی تھی اور

جب شب دیجور اپنے بال و پر پھیلاتی تو وہ ایسا محسوس کرتا کہ یہ رات اسکے لیئے اجنبی نہیں ہے۔ جیسے ہزاروں برس قبل بھی وہ ان راتوں اور ان راتوں کی تاریکیوں کا لطف اٹھا چکا ہے۔ قاہرہ میں آج اس کے قیام کا آخری دن تھا اس لیئے وہ بہترین لباس پہن کر گھومنے نکل گیا اور اس وقت تک گھومتا رہا جب تک کہ وہ تھک کر نڈھال نہ ہو گیا۔

اور جب صبح اسکی آنکھ کھلی تو قافلہ کا ہر شخص سفر کے لیئے تیار تھا۔ سلیم بھی چند منٹ کے اندر تیار ہو گیا۔

تمام دن موٹر پر سفر کر کے دریائے نیل کے کنارے والی سڑک پر چلتے چلتے اور نیل کی طغیانی پر آتی ہوئی موجوں کا لطف لیتے ہوئے وہ لوگ شام کے قریب لکسر پہونچ گئے۔ ایک جگہ انھیں ریگستان کا ایک مختصر سا علاقہ جس کا نام نمونیہ تھا عبور کرنا تھا لیکن جب لکسر پہونچ کر ایک پُر فضا جھیل کے وسط میں انھوں نے ابوالہول کا ایک مجسمہ دیکھا تو جیسے ان کی ساری تکان دور ہو گئی، لکسر کو اب نیر آباد کہا جاتا تھا، اور ہزاروں سال پرانے اس قصبہ نے دور جدید کی روشنی میں نہا کر بہت کافی ترقی کر لی تھی۔ سلیم کے قافلہ نے ونٹر پیلس ہوٹل میں قیام کیا جس کی طرز تعمیر قدیم مصری انداز میں کی گئی تھی اور جو دور سے کسی مصری فرعون کے محل کا روندا ہوا حصہ معلوم ہوتا تھا۔ ہوٹل کے چاروں طرف ایک خوبصورت باغ تھا جس کے خوبصورت پودوں اور جھومتے ہوئے درختوں کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے فرائش قدرت نے ہی اس کی ترتیب اور

تعمیر میں حصہ لیا ہے ۔

سلیم اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیر تک باغ کی دلفریبی کا لطف لیتا رہا، اور پھولوں سے معطر ہوا اس کو گہری مسرت اور سکون بخشتی رہی لیکن دھیرے دھیرے اس کو ایک عجیب دل گرفتگی اور پریشانی لاحق ہونے لگی۔ اور وہ بیچین ہو کر کھانے کے کمرے میں چلا آیا۔ جہاں لاتعداد مسافر رات کا کھانا کھا رہے تھے ۔

کھانے کے بعد اس نے کپڑے بدلے اور بستر پر دراز ہو گیا۔ تھکن کی وجہ سے اسے بیحد نیند آ رہی تھی لیکن لیٹنے کے بعد جیسے نیند کوسوں دُور ہو گئی، اور وہ بڑی دیر کروٹیں بدلتا رہا ۔ حد یہ کہ اس نے اکتا کر کمرے کی تمام کھڑکیاں کھول دیں اب ہوا میں تازہ شام کی سی فرحت بخش تازگی نہ تھی اور نہ باغ کے سبزہ میں حیات آفریں کشش ۔ پورے ماحول پر ایک عجیب قسم کی افسردگی چھائی ہوئی تھی، آسمان پر جگمگاتے ہوئے تاروں کا رنگ بھی مدھم پڑ گیا تھا ۔ ہوا میں تمازت تھی اور فضا میں انتہا درجہ کی اداسی ۔ سلیم کافی دیر تک کھڑکی میں کھڑا ماحول کی اس اداسی کا مقابلہ کرتا رہا اور نظروں ہی نظروں میں زلیخا کو تلاش کرتا رہا ۔ اس کو حیرت تھی کہ مصر کی زمین پر قدم رکھنے کے بعد سے ابتک شہزادی نے حسب معمول اپنی جھلک کیوں نہیں دکھائی ۔ وہ ابھی انھیں خیالات میں ڈوبا ہوا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ بالکونی میں ایک روشنی سی ابھر رہی ہے ۔ ایک عجیب طرح کی

دھندلی روشنی. جو نہ تو چاندنی سے مشابہ ہے اور نہ صبح کاذب کے نور سے ملتی جلتی ہے ۔۔۔ بس روشنی ۔۔۔ ایک ایسی روشنی. جو تاریکی کو دور کر رہی ہو ۔۔۔۔

سلیم کی نظریں اس پُر اسرار روشنی پر جم کے رہ گئیں ۔۔۔ کیونکہ زلیخا ۔۔۔ اس کے خوابوں کی شہزادی اس روشنی میں موجود تھی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی ۔۔۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے زلیخا کو اتنے خوف سے دیکھا اور خوف سے لرزے بغیر دیکھا ۔۔۔ کیونکہ ذہنی طور پر وہ خود زلیخا کو دیکھنے کے لیے بے چین تھا ۔۔۔ لیکن یہ منظر زیادہ دیر تک قائم نہ رہا ۔۔۔ روشنی کا یہ سایہ دھیرے دھیرے تاریکی میں ضم ہو گیا اور زلیخا غائب ہو گئی

تمام رات سلیم کو نیند نہ آئی، کیونکہ جب اس کی آنکھ لگتی کوئی بے چینی لیکر اسے جگا دیتی ۔۔۔ اور سلیم یہ کہہ کر اپنے دل کو تسکین دے لیتا کہ یہ سب گرم ہوا کے اثرات بد کا نتیجہ ہے جس نے اس کے اعصاب میں برہمی پیدا کر دی ہے ۔۔۔ لیکن کاش سلیم کو معلوم ہوتا کہ ۔۔۔ زلیخا تمام رات اس کے کمرے میں موجود رہی اور اپنی لافانی نیلی آنکھوں سے اپنے محبوب کو دیکھتی رہی ۔۔۔

اپنے محبوب "احمس" کو ۔۔۔ جو اسکی خوابگاہ کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا

باب ــــــ ۸

موسم گرما کے خواب سے بیدار ہو کر نیر آباد (لکسر) نے ایک خمار آلود انگڑائی لی اور اس کے بیدار ہوتے ہی قصبہ کی پوری آبادی بیدار ہو گئی۔ سلیم بھی اٹھا اور حوائج ضروری سے فارغ ہونے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سب سے پہلے اپنے مصری رہبر حسن اصغر سے ملے گا، نہ معلوم کیا بات تھی کہ صبح سے ہی وہ حسن اصغر کے بارے میں بالکل غیر ارادی طور پر سوچ رہا تھا۔۔۔ اور ارادہ کر رہا تھا کہ وہ اس مصری نوجوان سے نہ صرف دوستی کرے گا بلکہ اپنے قیام کا زیادہ حصہ اسی کے ساتھ بسر کرے گا۔۔۔ ایک لمحہ کے لئے اسکی نگاہوں کے سامنے حسن اصغر کی پر اسرار شخصیت ایک مجسمہ کی طرح ابھری۔۔۔ نازک خدوخال، ملیح نظریں، میٹھی آواز، آہستہ گوئی ۔۔ متین اور پر اسرار چہرہ ۔۔۔ اور وہ آنکھیں جن سے ہر وقت ناقابلِ تسخیر

قوت ارادی ابلتی رہتی تھی۔

چنانچہ ناشتہ سے فارغ ہوتے ہی اس نے حسن اصغر کو بلوا بھیجا اور پھر اس سے پروگرام بنا کر لکسر کی سیر کرنے نکل گیا۔ تمام دن وہ ساتھ گھومتے رہے، باتیں کرتے رہے۔ مسکراتے رہے۔ اور جب شام ہوئی تو ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنوں نے ان دونوں کی محبت اور باہمی خلوص دیکھ کر یہ فیصلہ صادر کیا کہ یہ دونوں آج سے نہیں ہزاروں برس سے ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

شام کے قریب وہ "قرناق" کے کھنڈرات دیکھنے گئے۔ کافی گرمی تھی، نیلا آسمان بیحد خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ اور بھرپور چاند کو دیکھ کر یہ شبہ ہوتا تھا کہ غالباً یہ وہی چاند ہے جس نے بنی اسرائیلوں کی "آئی سن" دیوی کو جنم دیا تھا۔ ناریل کے جھومتے ہوئے درخت پہریداروں کی طرح چہل قدمی کرتے دکھائی دے رہے تھے، کھنڈرات سے پہلے آبادی کے مکانات چاندنی میں بالکل سفید دکھائی دے رہے تھے اور دور بہت دور سے شہنائی کی میٹھی آواز نیل کی لہروں کی طرح اونچی نیچی ہوتی ہوئی بہت طلسم زدہ معلوم ہوتی تھی۔

وہ جلد جلد قدم بڑھا کر "قرناق" کے کھنڈروں میں پہونچ جانا چاہتا تھا کہ حسن اصغر نے اسکا ہاتھ پکڑ کر اپنی دلکش آواز میں کہا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ ہم بہرحال قرناق ہی جا رہے ہیں۔ اور اس لیے جا رہے ہیں کہ چاندنی رات میں وہاں کے پرسکون سناٹے کا لطف

اٹھا سکیں ــــ"

"میں کب جلدی کر رہا ہوں ــــ" سلیم نے مسکرا کر تردید کی۔

"نہیں سلیم ــــ شاید تم ہمیشہ کے جلدی باز ہو" حسن اصغر نے پُر اسرار آواز میں کہا "جلد بازی کی کیا ضرورت ہے؟ ہم سب ایک ہی راستہ پر گامزن ہیں تو پھر ہم ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کیوں کریں جبکہ ہر وہ چیز جو زندگی ہمیں دے سکتی ہے ہمارے پاس موجود ہے ــــ شام ابھی ختم ہو جائے گی اور رات آ جائے گی، یقیناً گذری ہوئی ہر رات کی طرح یہ رات بھی ہماری ہی ہے اور ہمیں اس سے ہر ممکن لطف حاصل کرنا چاہیئے کیونکہ جانے کے بعد یہ رات زندگی میں پھر کبھی واپس نہ آئے گی۔"

"تمھاری گفتگو میں عربی فلسفہ جھلک رہا ہے" سلیم نے کہا۔

"نہیں ــــ قدیم مصری فلسفہ ــــ جو زندگی ہی کو سب کچھ سمجھتا تھا" حسن اصغر نے ہلکی آواز میں جواب دیا اور اپنے قدم آہستہ کر دیئے۔

اب آبادی آ گئی ــــ بازار سے گذرتے وقت سلیم نے محسوس کیا کہ اس آبادی میں حسن اصغر کا فی عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ــــ اکثر یہ بھی ہوا کہ حسن اصغر کو آتے دیکھ کر بیٹھے ہوئے لوگ ادب سے کھڑے ہو گئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جبتک کہ وہ ان کے قریب سے گذر نہ گیا ــــ دونوں انتہائی سکون سے چلتے رہے حتیٰ کہ "قرناق" کے کھنڈرات جانے والی قدیم سڑک پر پہونچ گئے ــــ۔

"یہ وہی سڑک ہے۔ جو فرعون مصر سیٹی اول کی تعمیر کردہ ہیکل راع تک جاتی تھی ۔۔۔ قدیم زمانے میں اس سڑک پر اس سرے سے آخری سرے تک بُت نصب تھے۔ جن کا چہرہ نسوانی اور باقی جسم شیر کا تھا۔" حسن اصغر نے کہا۔

"تو گویا اس سڑک پر زلیخا بھی گذری ہوگی ۔۔۔" سلیم نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا۔

"ہاں ۔۔۔ زلیخا بھی، ۔۔۔ اس کا محبوب "احمس"، بھی احمس کا قریبی دوست گیتاری بھی اور زلیخا کا منگیتر "اسپاتا"، بھی۔ کون ہے۔ جو اس سڑک سے نہیں گذرا ۔۔۔ اور سچ پوچھو سلیم ۔۔۔ تو اس سڑک کے ذرہ ذرہ میں قدیم تاریخ بکھری ہوئی ہے ۔۔۔" حسن اصغر نے ٹھنڈی سانس لیکر کہا ۔۔۔

"تو کیا ۔۔۔" سلیم نے پوچھا۔ "احمس کا کوئی دوست گیتاری بھی تھا؟"

"ہاں ۔۔۔ قدیم مصر کی تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے ۔۔۔"

جلد ہی وہ دونوں ہیکل کے کھنڈر کے نزدیک پہنچ گئے جہاں ہر طرف ایک پُرہول خاموشی طاری تھی، اس ہولناک خاموشی کے پیش نظر سلیم نے مڑ کر حسن اصغر کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ چاندنی کی روپہلی روشنی میں اسکا چہرہ انتہائی پُرنور ہوگیا ہے ۔۔۔ اس چاندنی میں اٹھے حسن اصغر کا وجود ایک مرمریں مجسمہ کی طرح نصب نظر آیا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے دوست کی آنکھوں سے روشنی

کی ایک کرن سی پھوٹ رہی ہے۔ ـــــ

"حسن اصغر ـــ" سلیم نے گھبرا کر کہا۔

"میں موجود ہوں ـــ" حسن اصغر کے جواب نے اسکو مطمئن کر دیا!

آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے وہ دونوں کھنڈر میں داخل ہوئے ـــ جہاں ٹوٹے پھوٹے بتوں کی ایک لمبی قطار موجود تھی۔ـــ کسی بت کی آنکھوں سے نفرت جھلک رہی تھی اور کسی بت کی نگاہوں سے قہر ـــ

"یہ بت ہیکل کے پہریدار سمجھے جاتے تھے ـــ" حسن اصغر نے کہا اور کئی ابابیلیں پروں کو پھڑپھڑاتی ہوئی اس کے قریب سے گذر گئیں۔

دونوں آگے بڑھتے رہے۔ سلیم سنبھل سنبھل کر قدم رکھتا تھا لیکن حسن اصغر اس طلسمی تاریکی میں اس لاپرواہی سے چل رہا تھا جیسے سلیم نئی دہلی کی سڑکوں سے گذرا کرتا تھا۔ـــ چلتے چلتے دونوں ہیکل کے اس بڑے ہال میں پہونچ گئے جو مصری یادگاروں میں ایک پُرجلال یادگار سمجھا جاتا تھا۔ـــ حسن اصغر اس جگہ کے گوشے گوشے سے واقف معلوم ہوتا تھا، چنانچہ وہ ایک دیوار کے قریب پہونچا اور اپنی آبنوسی چھڑی دیوار پر لگا کر بولا ـــ "یہ تحریر اس عمارت کی تاریخ ہے ـــ اگر تم کہو تو میں اسکا ترجمہ سنا دوں ـــ"

"ہاں ـــ لیکن کیا تم قدیم مصری زبان سے واقف ہو" سلیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"تم ترجمہ سنو ـــ" حسن اصغر نے کہا۔" اس میں لکھا ہے ـــــ

— بطور ایک خدا کے
ایک معمار کی طرح
میں سیتی ٹ — مصر کا فرعون —.
جو کچھ امین کے لیے کرسکتا تھا کر چکا ہوں۔
میں نے ہیکل میں ایسے چوکور ستون نصب کرا دئے ہیں جن کی
اونچائی آسمان سے باتیں کرتی ہے۔ جو میرا لافانی گھر ہے۔
میں نے ایسی برجیاں بنوا دی ہیں جن سے شہر تھیبز دکھائی دیتا ہے۔
ایسے پھاٹک بنوا دئے ہیں جو کبھی گر نہیں سکتے،
ایسے باغ لگوا دئے ہیں جن پر خزاں اثر نہیں کرسکتی،
ایسے مرمریں حوض بنوا دئے ہیں جو کبھی خشک نہیں ہو سکتے۔
میں سیتی ٹ — مصر کا فرعون اپنے لڑکے رامیس کو حکم دیتا ہے کہ وہ
بھی فرعون بننے کے بعد امین دیوتا کی اسی طرح خدمت کرے۔"

ترجمہ کرنے کے بعد حسن اصغر ایک منٹ کے لیے خاموش ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے پھر کہا "سلیم — یہی وہ عبادت گاہ ہے جہاں کاہن اعظم کے سامنے سجدہ کر کے شہزادی زلیخا نے زندہ ممی بنانے کے لیے اپنے جسم کی پیش کش کی — یہی وہ ہال ہے جس کے وسط میں کھڑے ہو کر زلیخا نے چیخ چیخ کر اپنے محبوب احمس کی موت پر آہ و بکا کی اور آنسو بہائے یہی وہ جگہ ہے جہاں اس کی اور "اسپاتا" کی منگنی کا اعلان کیا گیا اور یہی وہ جگہ ہے جس کے ایک بلند مینار پر کھڑے ہو کر احمس کا دوست

"گیتا ری" شہزادی زلیخا کے زندہ جسم کے مقبرہ کی تعمیر دیکھتا رہا۔۔۔ سلیم۔ میں سچ کہتا ہوں یہ جگہ بہت اہم ہے۔۔۔ اتنی اہم کہ شہزادی زلیخا کی روح ہر روز یہاں ضرور آتی ہوگی۔۔۔"

"لیکن کیوں۔۔۔" سلیم نے لرزتی ہوئی آواز سے کہا۔

"اس لیے کہ اسی ہال کی پشت پر باغ کے ایک گوشے میں احمس اور زلیخا نے جوانی اور محبت کے نشے میں چور ہو کر ایک دوسرے سے جدا نہ ہونے کی قسم کھائی تھی۔۔۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں جنگ میں ہلاک ہو جانے والے "احمس" کی لاش دیوتا کے آخری دیدار کے لیے لائی گئی تھی اور زلیخا نے نم آنکھوں کے ساتھ اپنے محبوب کے مردہ لبوں کا بوسہ لیا تھا۔ پھر میں کیسے یقین کر لوں کہ زلیخا کی مضطرب روح یہاں نہ آتی ہوگی۔"

لیکن سلیم نے حسن اصغر کی باتوں کا کوئی جواب نہ دیا۔۔۔ وہ جیسے ماضی کی گمشدہ تاریخ میں کھو کر رہ گیا۔۔۔ اور جب وہ ہیکل کے کھنڈرات کی سیر کر کے واپس ہوا تو جیسے مصر کا جادو اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا، جیسے اس کا دل کہہ رہا تھا وہ مصر کا تھا۔۔۔ مصر کا ہے اور مصر کا رہیگا۔۔۔

ہوٹل آتے ہی اس نے اپنے باپ عازم الدین سے پوچھا "ڈیڈی ہم شہزادی کے مقبرہ کی کھدائی کے لیے کب یہاں سے روانہ ہونگے۔"

"کل صبح۔۔۔" عازم الدین نے جواب دیا لیکن باپ کو حیرت تھی کہ آج اس کے بیٹے کی آواز کیوں بدلی ہوئی ہے۔۔۔

رات گئے تک حسن اصغر سلیم کو قدیم مصر کی تاریخ سناتا رہا۔ اس نے کہا۔ "ہم اس وقت دنیا کے قدیم ترین علاقہ میں موجود ہیں۔ جہاں کی تہذیب، تمدن اور سائنس اتنی ترقی کر چکی تھی کہ جب موجودہ دنیا پر اس کے راز منکشف ہونگے تو آج کی دنیا انگشت بدنداں رہ جائیگی۔"

تقریباً گیارہ بجے رات کو حسن اصغر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

صبح ہوئی تو عازم الدین روانگی کے لیئے بالکل تیار تھے۔ سب موجود تھے لیکن سلیم اب تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔ عاجز ہو کر عازم الدین نے سلیم کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا اور جب کوئی آواز نہ آئی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ لیکن سلیم وہاں نہیں تھا۔ کمرہ بالکل خالی تھا۔

لمحہ بھر کے اندر پورے ہوٹل میں سلیم کی ناکام تلاش کے بعد کھلبلی مچ گئی ہر شخص پریشان تھا۔ لیکن حسن اصغر کے سکون میں کوئی کمی نہیں پائی جاتی تھی۔ ایک گھنٹے تک وہ ایک کھمبے سے لگا کچھ سوچتا رہا اور اس کے بعد اس نے عازم الدین اور عمرانی کو بلا کر کہا۔ "میں جانتا ہوں سلیم اس وقت کہاں سو رہا ہوگا"

"کہاں۔" دونوں نے گھبرا کر کہا۔

"کرناک کے قدیم کھنڈروں میں ہیکل کے ہال کے پیچھے ایک ایسے گوشے میں جہاں سیٹی اول نے ایک باغ بنوایا تھا۔"

اور واقعی جب پارٹی کے تمام افراد حسن اصغر کے ساتھ ہیکل کے پیچھے

زمانۂ ماضی کے باغ کے اس گوشے میں پہونچے تو سلیم ایک بڑے پتھر پر بے خبر سو رہا تھا ۔۔۔ قدموں کی چاپ سنتے ہی سلیم آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھا ، اس کے چہرے پر ناقابل بیان تازگی اور فرحت تھی ۔۔۔ اپنے چاروں طرف پارٹی کے تمام افراد کو موجود پاکر اس نے کہا ۔۔ "رات گھبرے میری طبیعت گھبرائی اور میں آپ میں سے کسی کو کچھ بتائے بغیر یہاں چلا آیا ۔۔۔ ڈیڈی ۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں ایسی فرحت زاد رات میری زندگی میں کبھی نہیں آئی ، ایسے سہانے خواب میں نے کبھی نہیں دیکھے ۔۔۔ ایسی میٹھی نیند میں کبھی نہیں سویا ۔۔۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ میرے یہاں آتے ہی ہواؤں نے مجھے لوریاں دیکر یہاں سلا دیا ۔۔"

سلیم کی گفتگو نے ہر شخص کو متاثر کیا ۔۔۔ اور ہر شخص پریشان ہو گیا سب سوچنے لگے ۔۔ " زلیخا ۔۔۔ بیدار ہونے سے قبل ہی سلیم کو پاگل نہ بنا دے ؟ ،، لیکن طرانی کچھ اور سوچ رہا تھا ۔۔۔ اور حسن اصغر وہ بالکل خالی الذہن ہو کر صرف اس نیلے گلاب کے پھول کو دیکھ رہا تھا جو سلیم کے سرہانے پتھر پہ رکھا ہوا تھا اور جس پر کسی کی نگاہ نہیں پڑی تھی ۔۔۔

باب ــــــ ۹

سخت الجھنوں کے ساتھ قافلہ کے تمام افراد مع کھدائی کرنے والے مزدوروں کے لشکر سے روانہ ہو گیا۔ ـــ انھیں ۲۲ میل چلنا تھا، راستہ میں حسن اصغر اور سلیم میں کافی باتیں ہوئیں اور جب حسن اصغر نے انتہائی پُر اسرار انداز میں سلیم سے دریافت کیا کہ اسے قرناق کے کھنڈروں میں سونے کے بعد کیا خواب دیکھے تو سلیم مسکرا دیا ـــ "مت پوچھو دوست ـــ یہ رات کتنی خوبصورت تھی، ہوٹل کے کمرے میں سونے کی نیت سے لیٹنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا کمرہ کسی خوشبو سے معطر ہو گیا ہے۔ بس یہی خوشبو تھی جس نے مجھ پر ایک وارفتگی سی طاری کر دی۔ ـــ کچھ دیر تک میں نشے کے عالم میں ٹہلتا رہا اور اس کے بعد مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں اس وقت قرناق کے کھنڈروں

میں تنہا تفریح کر دں۔ بس ۔ حسن اصغر تم یوں سمجھ لو کہ ایک غیر محسوس ہونے والی قوت تھی جو مجھے زنان کے محل کی طرف گھسیٹ لے گئی اور وہاں جاتے ہی میں ایک پتھر پر سو گیا۔

اب میں نے دیکھا کہ میں ایک قسم کے دیوان خانے میں کھڑا ہوا ہوں جو خیموں کے قیمتی پردوں سے بنایا گیا ہے۔ پرانے وضع کا ایک چراغ شمعدان میں جل رہا تھا اور ریتلی زمین پر صرف ایک قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ دیوان خانے کے بعد ایک خیمہ نما پردہ تھا میں کسی کی اجازت لیے بغیر اس خیمہ کا پردہ اٹھا کر اس میں داخل ہو گیا۔ اس خیمہ میں مینا کاری کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ سونے کا بنا ہوا ایک شمعدان سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ ایک جڑاؤ مسند تھی اور اس مسند پر اپنے مرمریں بازو کو عریاں کیے ہوئے شہزادی زلیخا لیٹی ہوئی تھی۔

حسن اصغر۔ میں سچ کہتا ہوں وہ شہزادی زلیخا ہی تھی،

شہزادی کے جسم پر تقریباً ویسا ہی لباس تھا جس میں میں اسے کئی بار دیکھ چکا تھا، اس کے خوبصورت ہاتھ شانوں تک کھلے ہوئے تھے۔ گلے میں سونے کا ایک جڑاؤ سانپ تھا اور بالوں میں نیلے کا ایک پھول لگا ہوا تھا۔ میرے آتے ہی اس نے اپنی بڑی بڑی بیضوی آنکھوں کو کھولا۔ وہ آنکھیں۔ جن پر اوپر اور نیچے نازک پلکوں کا جھالر لگا ہوا تھا۔ بالکل ویسی ہی نیلی آنکھیں جو میرے والد کی لائبریری کی تصویر سے مجھے دیکھا کرتی تھیں۔ وہ آنکھیں جو تغلق آباد میں مجھے

دیکھ کر مسکرا دی تھیں ۔۔۔

میں زلیخا کو بالکل قریب سے دیکھ رہا تھا ۔۔۔ اس کا سفید رنگ، نیلی اور نازک گردن، سنہرے بال، ۔۔۔ باریک ہونٹ، ۔۔۔ اور ایسی جادو بھری آنکھیں ۔۔۔ کہ میری قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی، میں بولنا چاہتا تھا لیکن بول نہ سکا۔

حسن اصغر ۔۔۔ میں بیان ہی نہیں کر سکتا کہ وہ کتنی حسین تھی، نہ اپنے جسم کو حرکت دیئے بغیر میں خاموش و ساکت چند منٹ تک اسے غور سے دیکھتا رہا ۔۔۔ کہ ایک خفیف سے تبسم کے ساتھ اس کے لب وا ہوئے، موتیوں کے سے چمکدار دانتوں کی جھلک دکھائی دی ۔۔۔ اور پھر اس نے اپنا سر اونچا کر کے میری طرف غور سے دیکھا ۔۔۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہہ رہی ہے لیکن میں اسکی زبان نہ سمجھ سکا ۔۔۔ چنانچہ جب میں نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے اپنا ایک ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا ۔۔۔ اب مجھ پر ایک دیوانگی سی طاری ہو گئی ۔۔۔ میں بالکل سحر زدہ ہو کر اس کے قریب پہونچ گیا ۔۔۔

شہزادی زلیخا بھی اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنا نرم و نازک ہاتھ میرے سینے پر رکھ کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں ۔۔۔

اور پھر اچانک میری آنکھ کھل گئی ۔۔۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا، چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا تھا ۔۔۔ اور حقیقت یہ ہے

کہ ماحول اتنا ڈراؤنا اور ہیبتناک تھا کہ مجھے ڈر کر بیہوش ہو جانا چاہیئے تھا لیکن میں اس خواب کی لذت میں ماحول سے بے نیاز ہو کر ایک مرتبہ پھر سو گیا ۔۔۔۔

اب میں نے دیکھا کہ میں دوبارہ اسی خیمے میں ہوں ۔۔۔ اور شہزادی زلیخا غصہ کے عالم میں ٹہل رہی ہے ۔ شہزادی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات تھے ۔۔۔ وہ بار بار اپنے سینے پر ہاتھ مار رہی تھی ۔۔۔ اسی سینے پر جس میں ماضی بعید کے بے پناہ راز دفن تھے ۔۔۔ اس پریشانی میں بھی وہ دنیا کا حسین ترین مجسمہ معلوم ہوتی تھی ۔۔۔ اچانک اس نے اپنا چہرہ اپنے چاندنی جیسے لطیف اور نرم و گداز بازوؤں میں چھپا لیا ۔۔۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی حور کے چہرے کو نور کی لہروں نے متاثر کر لیا ۔

شہزادی زلیخا رو رہی تھی ۔

وہ روتی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا ۔۔۔ وہ بار بار خیمہ کا پردہ اٹھا کر باہر کی جانب خونخوار نظروں سے دیکھتی لیکن جب میری طرف دیکھتی تو اس کی نظروں میں غصہ اور نفرت کا شائبہ تک نہ ہوتا ۔۔۔ یقین جانو حسن اصغر اس وقت بھی اسکا چہرہ دیکھ کر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی جادوگر نے ہاتھی دانت کے بنے ہوئے کسی چہرے میں روح پھونک دی ہو ۔۔۔۔

وہ بےچینی کے ساتھ خیمہ میں ٹہل رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ

وہی شہزادی ہے جس نے آج سے ہزاروں برس قبل سورج کو نکلتے اور غروب ہوتے دیکھا تھا۔ جس نے سیٹی اول کے جاہ و جلال کا مظاہرہ دیکھا تھا اور جس نے زندہ ممی کے لیے خود کو پیش کیا تھا۔

اور پھر اچانک زلیتھا نے کہا "احمس — میرے محبوب — تمہیں معلوم ہوا کہ فرعون میری شادی اپنے ایک رشتہ دار اسپاتا سے کرنا چاہتا ہے — لیکن ایسا نہیں ہو سکتا رب راع کی قسم ایسا ہرگز ممکن نہیں ہے۔"

اور حسن اصغر — اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی — کھنڈر بدستور خاموش تھے، ماحول میں جنگلی پھولوں کی مہک بدستور باقی تھی — ہر طرف سناٹا تھا، دور بہت دور سے رات کے پرندوں کے چیخنے کی آوازیں آ رہی تھیں — اور میں سوچ رہا تھا کہ زلیتھا نے مجھے احمس کہہ کر کیوں مخاطب کیا؟

"اس لیے کہ تم واقعی احمس ہو۔" حسن اصغر نے کہا "واقعات کا تسلسل بتا رہا ہے کہ زلیتھا کی بے چین اور مجبور روح نے دنیا کے کروڑوں انسانوں میں سے صرف تمہیں اپنے دیدار کے لیے اس لیے منتخب کیا ہے کہ تمہاری شکل و صورت اس احمس سے جو قرناق کے کسی گوشے میں ابدی نیند سو رہا ہو گا بالکل مشابہ ہے اور کیا عجب ہے کہ جسم کے علاوہ تمہاری روح بھی وہی ہو جو احمس کے بدن میں مقید تھی —"

"مجھے ساری بات بتاؤ حسن اصغر — تم ادھوری باتیں کہہ کر

میری الجھنیں بڑھا رہے ہو۔" سلیم نے اضطرابی لہجے میں کہا،

"میں نے تمھارے آج کے حادثے کے بعد خود فیصلہ کیا تھا کہ میں تمھیں ساری کہانی سنا دوں ۔۔۔ جو ایک عرصہ سے میرے سینے میں گھٹ رہی ہے اور غالباً جس کے بیان اور جس کے خاتمہ کے لیئے میں ابتک زندہ ہوں" حسن اصغر نے اپنے پُر اسرار لہجہ میں کہا۔۔۔ سنو ۔۔۔

میں تمھیں جو کچھ بتانے جا رہا ہوں وہ تہذیب سے پہلے کی بات ہے، یہ میری کسی عظیم تحقیق یا کسی شاندار دریافت کا نتیجہ نہیں ۔۔۔ لیکن اسمیں گذرے ہوئے گمشدہ ماضی اور اپنے دامن میں ہزاروں اُلجھنیں لیئے ہوئے حال کی تفصیل ضرور ہے، کیونکہ ہم در اصل اس مہذب ماضی کے وارث ہیں جس کی تخلیق میں مصر کا بہت بڑا حصہ ہے ان مصریوں کا جنھوں نے سب سے پہلے روح کے غیر فانی ہونے کا عقیدہ پیش کیا ۔۔۔

آج کے ایٹمی دور کا مورخ قدیم مصر کی تاریخ کو وحشت اور بربریت کی داستان سے تعبیر کرتا رہتا ہے لیکن وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وحشت اور بربریت کے اس عظیم الشان اور لافانی دور کا یہ مصری انسان بہت سی خوبیوں کا بھی مالک تھا، بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ وہ موجودہ تہذیب کا اولین معمار بھی وہی تھا ۔۔۔ کیونکہ اگر آج کا مہذب اور تعلیم یافتہ انسان کسی دانش گاہ یا ایٹمی تحقیق گاہ کے بلند مینار پر کھڑا ہو کر پیچھے کی طرف دیکھے تو وہ مصر کے انہی وحشی اور بربری انسانوں کو موجودہ علوم و فنون کی داغ بیل ڈالتے دیکھے گا۔

سلیم میرے دوست ۔۔۔۔۔ میری اس غیر دلچسپ گفتگو سے اکتا نا ، کیونکہ میں در اصل تمھاری ہی کہانی بیان کرنے جا رہا ہوں ۔۔۔۔ ایک ایسی کہانی جس کا آغاز ہزاروں برس قبل ہو چکا ہے لیکن انجام کا کسی کو علم نہیں ۔۔۔۔

میں تمھیں یہ کہانی نہیں ایک پوری تاریخ سنا رہا ہوں ۔۔۔۔

دورِ بربریت کا ایک قافلہ نیل کے سرسبز و شاداب کناروں پر رکا اور اچھی آب و ہوا نیز پانی کی فراوانی نے اس قافلے سے آگے بڑھنے کا ارادہ چھین لیا ، دھیرے دھیرے اہل کاروان کی تعداد بڑھنے لگی ، بستیاں آباد ہونے لگیں ، آس پاس کے بدوی قبیلوں سے تجارت ہونے لگی ۔۔۔ اور نیل کا کنارہ انسانی تہذیب کا پہلا گہوارہ بن گیا ، چند صدیوں کے بعد نیل دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ۔۔ ایک زیرین نیل اور دوسرا بالائی نیل ۔۔ دونوں علاقوں کے لوگ نیل کے پرسکون پانی کے بیٹے تھے لیکن صدیوں کی علیحدگی نے ان میں اختلافات پیدا کر دیا ، فرزندان نیل کی یہ دو جماعتیں آپس میں لڑنے لگیں ، یہاں تک کہ بالائی مصر کے ایک حکمران نے دونوں مصریوں کو متحد کر دیا ۔۔۔۔ اس حکمران کا نام "مینس" تھا ۔۔ مینس نے "مینس" شہر کی بنیاد ڈالی اور مصریوں کے لیے کچھ مذہبی رسوم بنائیں ، اسی مینس کی ایک اولاد نے جس کا نام "خوفو" تھا وہ اہرام بنایا جو آج مصر کا سب سے عظیم الشان اہرام سمجھا جاتا ہے ۔۔۔۔

بالائی مصر کا خاندان پورے مصر پر طاقت اور جبر کے ساتھ حکومت

میں یہ تھا کہ زیرین مصر کے عوام نے بغاوت کردی ۔ زیرین مصر آزاد ہو گیا اور "توس مس اول" نام کے ایک سردار کی حکومت قائم ہو گئی ۔

اسی "توس مس اول" کا ایک جانشین سیٹی اول تھا ۔ مصر کے اس فرعون کو عمارتیں بنوانے کا نئی نئی ایجادوں کا بہت شوق تھا ۔ چنانچہ اس نے ایک زندہ انسان کی ممی بنانے کا فیصلہ کیا اور مصر کے قدیم تاریخ میں شہزادی زلیخا داخل ہو گئی ۔ سیٹی اول کا مقبرہ "تھیبز" کے کھنڈروں میں مل چکا ہے اور اسکی ممی قاہرہ کے عجائب گھر میں موجود ہے ۔

"سیٹی اول" نے انتہائی طاقت حاصل کرنے کے بعد خود کو فرعون کہا اور اپنی حکمت عملی سے مصری تہذیب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کر لی ۔ مصر کے طول و عرض میں فرعون کو سورج کا بیٹا سمجھا جانے لگا ۔ وہ دیوتا ہو گیا اور دوسرے دیوتاؤں کی طرح اسکی پرستش کے لیے بھی الگ مندر بنائے گئے ۔ فرعون کی اطاعت ہر مصری پر فرض ہو گئی ۔ مندروں کی حفاظت اور قربانی کے لیے کاہن مقرر کئے گئے ۔ سورج کو سب سے بڑا دیوتا مان لیا گیا ۔

لیکن فرعون کی پرستش لازم قرار دیدی گئی ۔

اہرام بننے لگے ۔

اہرام کی تعمیر کا سبب صرف خوف تھا ۔ مصر کے فرعون فنا ہو جانے سے بہت ڈرتے تھے ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ انسان مرنے کے بعد بھی اس وقت تک زندہ رہتا ہے جب تک اس کا جسم باقی رہتا ہے لیکن انسانی جسم کے فنا ہوتے ہی روح بھی ہمیشہ کے لیئے فنا ہو جاتی ہے ۔ مصر کے فرعون لافانی

بننا چاہتے تھے اس لیئے انھوں نے مرنے کے بعد بھی اپنے جسم کی حفاظت کی۔
۔۔۔۔ اور وہ ایک بڑی حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے۔۔۔۔
لیکن فرعون مصر سیبیٹ اوّل اسکے آگے بھی کچھ سوچ رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا جب روح فنا نہیں ہوتی، جب جسم محفوظ رکھا جا سکتا ہے تو پھر آیندہ زندگی کا انتظار کیوں ۔۔۔؟ ہم کیوں نہ موت پر قابو پائیں، روح کو جسم کا تابعدار بنا لیں اور قبل اس کے کہ انسان مرے ہم اس کو سُلا دیں تاکہ روح جسم سے نکلنے نہ پائے اور اگر اپنی انتہائی طاقت کے بل پر جسم چھوڑ بھی دے تو اس کے لیئے مجبور ہو جائے کہ وہ دوبارہ جسم میں واپس آئے۔ اس نے سوچا ۔۔۔ ایک ایسا تجربہ کیوں نہ کیا جائے ۔۔۔!!!

کسی انسان کو سلا کر اسے زندہ جسم کی ممی کیوں نہ بنائی جائے، جسم کی بھی اور روح کی بھی ممی ۔۔۔۔ اور اس طرح روح کو ایک مخصوص مدّت تک کے لیئے قید کر لیا جائے ۔۔۔۔ اس نے اپنے اس فلسفہ پر اپنے حکیموں اور کاہنوں سے مشورہ کیا اور اس کے مشیر اس تجربہ پر لیئے تیار ہو گئے، روح، جسم اور مسئلہ تناسخ پر بڑی زبردست بحثیں ہوئیں۔ مسئلہ کے ہر پہلو پر پوری سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ اور مصر کے ہر بڑے حکیم سے اس کی رائے مانگی گئی ۔۔۔ تمام حکماء نے سیبیٹ اول کی تجویز سے اتفاق کیا سوائے ایک کے ۔۔۔ جس کا نام تفیظان تھا ۔۔۔ اس حکیم نے سیبیٹ اول سے کہا۔ وہ کسی جسم کے غیر فنا ہی ہونے کا خیال ہی بالکل خلاف عقل اور ناقابل یقین ہے ۔۔۔ بلکہ درحقیقت اس خیال کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے، کیونکہ جسم جن

اشیاء کا مرکب ہے وہ بہرحال فانی ہیں۔ اب رہی روح۔ اور اسکا جسم میں ہمیشہ قید رہنا۔ تو انسانی جسم میں ایسی صفت ہے ہی نہیں کہ روح کو ہمیشہ کے لیے جسم میں باقی رکھا جائے۔

اس حکیم نے فرعون سے کہا۔" اگر تجربہ ہی کرنا ہے تو ایسا جسم تلاش کیا جائے جو تمام مادّی صفتوں سے بالکل پاک ہو۔ جو نہ خود مادّہ ہو نہ مادّہ میں ہو۔ نہ اس پر موقوف ہو اور نہ اس سے کوئی لگاؤ ہو۔ لیکن اے فرعون۔ اے سورج کے بیٹے۔ ایسا کوئی جسم آج تک تخلیق ہی نہیں کیا گیا۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ ایسا کوئی تجربہ نہ کیا جائے اس لیے کہ بلا وجہ۔ اس طرح ایک انسان کی جان کا اتلاف ہوگا۔"

لیکن فرعون سیتی اوّل اپنی ضد پر قائم رہا۔ اور ایک ایسے زندہ انسان کی تلاش ہونے لگی جو اپنا زندہ جسم ممی بنانے کیلیے پیش کرے۔

یہی وہ زمانہ تھا جب شہزادی زلیخا اپنے محبوب "احمس" کی جدائی میں رو رہی تھی اور اسیاتا کے ساتھ اس کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔ زلیخا ہر روز شام کے بعد ترناق کے باغ میں آتی اور گلاب کے اس کنج میں بیٹھ کر جہاں وہ احمس سے مل کر محبت کے گیت گایا کرتی تھی آنسو بہاتی اور جب رات کی سیاہی پوری طرح پھیل جاتی تو اپنی نم آنکھوں کے ساتھ واپس آجاتی۔

سلیم۔ میں تم سے کیا بیان کروں کہ اس زمانے میں زلیخا کتنی

پریشان تھی۔۔۔ اس کی گلابی باہنیں سفید ہو گئی تھیں، صحت مند گداز جسم گھُل کر رہ گیا تھا، نیلی آنکھیں کسی تالاب کی طرح سوکھ کر رہ گئی تھیں، دمکتا ہوا چہرہ مرجھا کر رہ گیا تھا۔۔۔ اور وہ حزن و ملال اور افسردگی کے ایک زندہ مجسمہ میں بدل کر رہ گئی تھی۔۔۔

زلیخا۔۔۔ مجبور اور نامراد زلیخا۔۔۔ ہر رات خواب دیکھتی کہ نیل کے سرسبز کنارے پر وہ احمس کے ساتھ ٹہل رہی ہے۔۔۔ اور احمس نے اسکے جلتے ہوئے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھکر کہا۔۔۔ "اے میرے دل کے ہر گوشے پر حکومت کرنیوالی ملکہ۔۔۔ ان مست و مدہوش ہواؤں کی قسم آسمان پر چمکنے والے چاند اور تاروں کی قسم۔۔۔ میں تمھیں اپنا بنا کے رہونگا۔ خواہ اس کے لیے مجھے ہزاروں برس کیوں نہ انتظار کرنا پڑے۔۔۔"

اور پھر جیسے فضا میں ایک نیا نغمہ بکھر جاتا۔۔۔ نیل کی لہریں ان دونوں کی پاکیزہ محبت کا یہ منظر دیکھ کر ایک نیا گیت شروع کر دیتیں، اور احمس کہتا ۔۔۔ "زلیخا۔۔۔ تمھارے بغیر میری زندگی میں کبھی صبح آئے گی ہی نہیں، اور میں ہمیشہ روشنی کی تلاش میں بھٹکتا رہوں گا۔۔۔ میں سچ کہتا ہوں۔۔۔ تمھاری آنکھوں میں شراب ہے، آواز میں موسیقی ہے، ۔۔۔ تم عورت نہیں کلیوں کا تبسم اور پھولوں کی خوشبو ہو، تم میری زندگی کی آخری بہار ہو ۔۔۔ تم میرا سب سے حسین تخئیل ہو اور فطرت کا سب سے خوبصورت تحفہ ہو ۔۔۔ جو میرے لیے اور صرف میرے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔۔۔"

اور پھر زلیخا کہتی ۔۔۔ "احمس ۔۔۔ اپنی پیاسی محبت کو سیراب کرنے

کے لیے میں بھی اپنی زندگی کے آخری سانس تک تمہارا انتظار کرونگی"

زلیخا ـــــ کی ہر رات انھیں محبت بھرے خوابوں میں کٹ جاتی اور دن ـــــ احمس کے انتظار میں کہ وہ جنگ سے واپس نہیں آیا۔ ـــــ لیکن ایک دن بالکل اچانک زلیخا کے تمام خواب منتشر ہو کر رہ گئے۔ خبر آگئی کہ احمس جنگ میں مارا گیا۔ ـــــ خبر سنتے ہی زلیخا سینہ پکڑ کر بیٹھ گئی اور اسپاتا کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ـــــ

اسپاتا یعنی اس کے منگیتر کو اب بالکل یقین ہو گیا کہ زلیخا کی شادی اب اس سے ہو جائے گی۔ ـــــ لیکن زلیخا کچھ اور فیصلہ کر چکی تھی۔ ـــــ اس نے اپنے محبوب کے دوست گیتاری سے مشورہ کیا اور ـــــ پھر ایک رات خود فرعون سیسیٹ اوّل کے دربار میں حاضر ہو کر زندہ ممی کے لئے اپنا جسم پیش کر دیا۔ ـــــ

اور اس طرح میرے عزیز دوست سلیم ـــــ زلیخا کی کہانی شروع ہو گئی، وہ کہانی جس کا انجام ابھی باقی ہے۔ ـــــ؟

حسن اصغر اس کے بعد خاموش ہو گیا۔ ـــــ اور سلیم نے اس کہانی پر اپنا ردّ عمل نہیں ظاہر کیا۔ ـــــ وہ صرف سوچتا رہا ـــــ آگے بڑھتا رہا ـــــ ماضی کے تاریک پردوں کو چیرتا رہا ـــــ اور پھر جیسے اس کے دل کے کسی گوشے سے آواز آئی "میں احمس ہوں۔ ـــــ زلیخا کا محبوب ـــــ جس کی جدائی میں اس نے زندہ ممی بننے کے لئے خود کو پیش کر دیا تھا۔"

سلیم انتہائی کشمکش و پیچ میں مبتلا رہا۔ ـــــ چنانچہ تمام راستے وہ کچھ نہ بولا

سوائے اس کے کہ کبھی کبھی اس نے حسن اصغر کی طرف دیکھا۔ جو ایک بُت کی طرح خاموش تھا ـــ مصر کے اسرار کی طرح ـــ موت کی طرح ـــ لاش کی طرح ـــ اور جیسے سلیم دل ہی دل میں لرز گیا ـــ اس کے ذہن میں کئی تصویریں ابھریں اور ڈوبیں ـــ بس اسے اتنا محسوس ہوا کہ اس نے حسن اصغر کو مصر آنے سے قبل بھی کہیں دیکھا ہے ـ کہاں دیکھا ہے یہ اسے مسلسل سوچنے کے بعد بھی نہ یاد آسکا ـــ

ادھر سلیم ان الجھنوں میں تھا اور اُدھر خان بہادر عازم الدین سے جو آج صبح کے حادثے کے کافی پریشان تھے اور جنھیں قرناق کے کھنڈروں میں تمام رات سلیم کے موجود رہنے نے خوف زدہ کر دیا تھا مصدق طرانی کہہ رہا تھا ـ "حسن اصغر کی شخصیت نے مجھے حیران کر رکھا ہے، لکسر آکر مجھے اس کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا وہ اس سے قبل مجھے قطعی نہیں معلوم تھا ـ خان بہادر صاحب اس شخص کے بارے میں مجھ سے جو کچھ کہا گیا ہے مجھے اس پر یقین ہی نہیں آتا ـــ"

"مثلاً ـــ کیا کہا گیا ہے ـــ" عازم الدین نے کہا ـ

"لکسر کے رہنے والے معززین نے مجھے بتایا ہے کہ حسن اصغر کے علم کی کوئی انتہا نہیں ـــ وہ اپنی تنہائی کے بیشتر لمحات قرناق کے بھیانک کھنڈروں میں گزارتا ہے ـــ مصر کی قدیم زبان انتہائی فراوانی سے بولتا ہے جبکہ اس نے کسی درسگاہ میں اس زبان کی تعلیم نہیں حاصل کی ہے ـ اور اکثر دات کی تاریکی میں اسے کسی اَن دیکھی شئے سے قدیم مصری زبان میں ہمکلام

پایا گیا ہے ___"

"حیرتناک ___" عازم الدین کے منہ سے بے تحاشہ نکل گیا۔

"یہی نہیں ___ بلکہ میں نے یہاں آکر یہ بھی سُنا ہے کہ وہ اپنے مرحوم باپ کی شکل سے بالکل مشابہ ہے، اور اسکا باپ اپنے باپ کی شکل سے بالکل مشابہ تھا، یعنی اس کے خاندان میں ہمیشہ ایک ہی اولادِ نرینہ پیدا ہوئی اُس نے ہمیشہ اپنے باپ کی شکل پائی ___ گویا اس طرح حسن اصغر کی موجودہ شکل و صورت قد و قامت رنگ و روپ بالکل اپنے جدِ امجد کا سا ہے ___ وہ جدِ امجد جو شاید ہیں کہیں کسی قبرستان کے زیرِ زمین دوز تہہ خانے میں کسی تابوت میں سو رہا ہو گا ___"

"یعنی آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہزاروں سال قبل اس کے مورثِ اعلیٰ کی جو شکل تھی وہی آج کے حسن اصغر کی ہے ___" عازم الدین نے بے چین لہجہ میں کہا ___

"ہاں ___ اور اسی لیے میرا اندازہ ہے کہ حسن اصغر ہمارے قافلہ کی سب سے پُر اسرار شخصیت ہے اور وہ شاید کسی خاص مقصد اور کسی اسرار کے تحت ہی ہمارے قافلہ میں شامل ہوا ہے ___ کیونکہ ___" طہرانی کہتے کہتے خاموش ہو گیا،

"ہاں ہاں ___ کہو ___ تم کیا کہنا چاہتے ہو طہرانی ___" عازم الدین جلدی سے بولا۔

"کیونکہ حسن اصغر ___ کو میں نے نہیں خود اس نے مجھے تلاش کیا تھا ___

قاہرہ کی بازاروں میں از خود ہی مجھے تلاش کر رہا تھا اور جب میں اس سے ملا تو اس نے انتہائی مودبانہ لیکن پُر اسرار لہجہ میں ایک گائیڈ کی حیثیت سے اپنی خدمات پیش کر دیں جبکہ میں نے اس سے اپنی مہم کے بارے میں قطعی کوئی لفظ نہیں کہا تھا۔" طہرانی نے دھیمے دھیمے کہا۔

"گویا اس کا مطلب یہ ہے کہ حسن اصغر کو پہلے سے ہماری آمد اور ہماری مہم کی تفصیلات کا علم تھا۔" عازم الدین نے گھبرا کر کہا۔

"پہلے میں نے مسئلہ کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن اب میرا یہ خیال ہے کہ وہ ہماری مہم کے بارے میں پہلے سے واقف تھا اور شاید وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ہماری مہم کا انجام کیا ہوگا۔ عازم الدین یہ ایک بے چین، مضطرب اور محبت کی ماری ہوئی روح کا معاملہ ہے اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ہم کس اسرار سے دو چار ہو چکے ہیں۔"

طہرانی یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

باب ــــــــ ۱۰

شام کے قریب دہلی کا یہ قافلہ تغلق آباد کے کھنڈروں والے بزرگ کے بتائے ہوئے پتہ پر پہونچ گیا ۔۔۔ اور خیمے نصب کر دیئے گئے۔ قافلہ کا قیام سڑک سے ذرا ہٹ کر ایک وادی میں تھا جو قدیم شہر تھیبز سے فرسخت جاتی تھی، شمال کی طرف ایک پہاڑ تھا جس کی چوٹی پر دور قدیم کا تعمیر شدہ ایک ایسا حفاظتی مینار تھا جس کو فرعون کے زمانے میں مقبروں کے محافظ استعمال کرتے تھے، وادی کے اطراف میں جگہ جگہ پتھریلے مکانوں کے ویرانے پھیلے ہوئے تھے ۔۔۔ غالباً یہ مکانات بھی محافظوں اور چوکیداروں کی قیام گاہ تھے، وادی کے دائیں جانب پتھروں کے ایک انبار پر ایک سنگی سینگ نصب تھا جو تاریخ میں "القرن" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

وادی اتنی پُر اسرار سنسان اور ویران تھی کہ غالباً ایک عرصے سے یہاں کسی زندہ انسان نے قدم نہ رکھا ہوگا، مضافات میں بھی کوئی آبادی نہ تھی، تقریباً ساڑھے بارہ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ضرور تھا جہاں صرف وہ مزدور رہتے تھے جن کو کھدائی کے لیے حاصل کر لیا جاتا تھا، سلیم کے اس قافلہ میں شامل مزدوروں کی اکثریت بھی اسی گاؤں کی رہنے والی تھی ۔۔۔ وادی تک پہونچنے کے لیے کسی انجانے آدمی کو پہاڑ کی ناہموار چوٹیوں اور پیچیدہ راستوں کو عبور کرنا پڑتا تھا ۔۔۔ اس لیئے طہرانی کو یہ مقام بہت پسند آیا ۔۔۔ اسکا کہنا تھا کہ اس طرح ہم ہر ایک کی نگاہ سے چھپ کر سکون اور اطمینان سے مقبرہ کی کھدائی کر سکیں گے ۔

ابھی ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخی باقی تھی کہ سلیم وادی کی سیر کو نکل گیا، وہ ایک ٹیلہ پر چڑھ کر شفق میں نہائے ہوئے ان بوسیدہ مقبروں کو دیکھنے لگا جو حدِ نظر تک پھیلے ہوئے تھے ۔۔۔ قریب ہی دریائے نیل انتہائی غرور بھرے انداز میں بہہ رہا تھا، ہر طرف ایک سکوت تھا ۔ دل کو ہلا دینے والا سناٹا تھا، وادی میں اس کے قافلہ کے خیمے نصب تھے، جس میں شام کے کھانے کی تیاری ہو رہی تھی اور آقائے طہرانی اپنے احباب کو یہ بتا رہا تھا کہ اندھیرا ہوتے ہی وہ شہزادی کا مقبرہ تلاش کرنے نکل جائیں گے ۔۔۔ دیر تک سلیم یہ منظر دیکھتا رہا اور جب اندھیرا پھیلنے لگا تو وہ بھی صبر و سکون کا انتظار کرنے والی ایک گہری

.... لیکر ٹیلہ سے نیچے اُتر آیا۔

اپنے خیمے کی طرف جاتے ہوئے سب سے پہلے اسکی ملاقات حسن اصغر سے ہوئی۔ جس نے اس سے کہا۔ "یہ روحوں کی وادی ہے سلیم یہاں اکیلے نہیں گھوما جاتا۔۔۔ آج کے بعد اسکا خیال رکھنا۔۔"

شام کا کھانا وسط کے خیمے میں کھایا گیا۔ خلاف معمول آغائے طہرانی بالکل خاموش رہا، دن بھر کے سفر اور تکان سے بوڑھے ایرانی کی سفید جلد سیاہ پڑ گئی تھی۔۔۔ ڈاکٹر بیگ نے کھانے کے دوران میں دو ایک مذاق کئے بھی لیکن مہم کے تصوّر میں ڈوبے ہوئے لوگوں نے کوئی خاص توجّہ نہ کی۔۔۔ اور اسی سکوت و جمود کے ماحول میں کھانا ختم ہو گیا۔۔۔

اب بھی سب خاموش تھے۔۔۔ کہ اچانک دور بہت دور سے ایک میٹھی اور سُریلی آواز سی سُنائی دی، اور اس کے ساتھ ہی گھنٹیوں کی آوازیں بھی۔۔۔ ہر شخص خیمے سے باہر نکل آیا۔۔۔

آبنوس کے درختوں کے لمبے سائے وادی میں پھیل گئے تھے، اطراف کے کھنڈر چاند کی روپہلی روشنی میں چمک رہے تھے۔۔۔ فضا کا سکوت موسیقی کی لہروں سے ٹوٹ چکا تھا۔۔۔ دراصل یہ آواز اس قافلہ کی طرف سے آ رہی تھی۔ جو لکسر سے فرشت کی طرف جا رہا تھا۔۔۔

حسن اصغر نے کہا۔۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں یہ کارواں "مھوارہ"

نام کے ایک قصبے سے آ رہا ہے اور صرف تاجروں پر مشتمل ہے، اگر ان لوگوں کی ہمارے خیمہ پر نگاہ پڑ بھی گئی تب بھی یہ ہمارے قیام کی نوعیت سے کوئی دلچسپی نہ لیں گے۔۔۔

چند منٹ تک بالکل خاموشی طاری رہی حتیٰ کہ گذرتے ہوئے کارواں کی آواز فضا میں تحلیل ہو گئی۔۔۔ اب گویا میدان صاف تھا طہرانی نے کہا" میرے خیال میں اب شہزادی کے مقبرے کی تلاش شروع کرنے کا وقت آ گیا ہے، آئیے ہم سب لوگ تیار ہو جائیں۔۔۔"

کس میں ہمت تھی کہ وہ طہرانی کے پروگرام میں رد و بدل کرتا۔ آدھ گھنٹے کے اندر تمام لوگ تیار ہو گئے۔۔۔ مہم کے شرکاء نے حسن اصغر کے مشورے پر وہ راستہ اختیار کیا جو عام راستوں سے بالکل مختلف تھا کیونکہ اس میں جگہ بہ جگہ گہرے غار دکھائی دیتے تھے۔ پتھر کے ناہموار ٹیلے تھے، اور بے ہنگم چٹانیں تھیں۔۔۔ ایک گھنٹے کی جدّ و جہد کے بعد وہ ایک ایسے پہاڑ کی چوٹی پر پہونچ گئے، جس کے نیچے تاریکی کی آغوش میں شاہانہ تزک و احتشام سے خاندان فرعون کی بیگمات ابدی نیند سو رہی تھیں اور دُور سے وہ قلعہ نما پہاڑ دکھائی دے رہا تھا جو کبھی "دیوی ہاتھرس" کی حیثیت سے مقدس خیال کیا جاتا تھا۔ ہر شخص تھک چکا تھا سوائے حسن اصغر کے۔۔۔ جس کے چہرے پر تھکن اور تکان کے بجائے زندگی کا ایک نیا جوش اور ایک تازگی امنگ رقص کر رہی تھی، آغائے طہرانی اور خان بہادر عازم الدین نے دزدیدہ نظروں

..ں لیکر ٹنے کے چہرے کی طرف دیکھا ــــ اس کے چہرے کی تبدیلی کو محسوس کیا ..ر منزل کی طرف اپنے قدم بڑھا دیے - اب زمین کی ساخت نے انھیں مجبور کر دیا تھا کہ وہ ایک قطار بنا کر چلیں ــــ یقیناً یہ اجنبی راہ گیر نقشے کے باوجود راستہ بھول جاتے اگر حسن اصغر آگے بڑھ کر ان کی قیادت نہ کرنے لگتا ــــ

متعدد ویران مقبروں اور پیچیدہ راستوں سے گذرنے کے بعد .. تھکے ہوئے انسانوں کا یہ کارواں ایک بڑے ٹیلہ کے قریب پہونچ گیا ــ حسن اصغر نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو رکنے کے لیے کہا اور پھر بہت آہستہ آواز میں جو جوش اور وارفتگی سے بھری ہوئی تھی کہا ــــ "ہم اپنی منزل تک پہونچ گئے ــــ"

اور جیسے ہر شخص کی تکان دور ہو گئی، اب وہ پہاڑی سلسلہ سے منقطع ایک ایسی سیاہ چٹان کے سامنے کھڑے تھے جس کی ناہموار سطح پر جگہ جگہ سوراخ اور شگاف تھے، پتھر سے بنے ہوئے ایک پشتہ کو حسن اصغر نے اپنی لکڑی کی مدد سے کریدنا شروع کیا ــــ حسن اصغر کی اس والہانہ حرکت کو دیکھنے میں ہر شخص منہمک ہو گیا ــ ہر ذہن میں اضطراب تھا سوائے سلیم کے ــــ جس کو نہ معلوم کیوں اصغر کی ذات اور اس کے افعال پر پورا بھروسہ تھا ــــ انتہائی بے نیازی کے ساتھ وہ اس پشتہ کو دیکھنے لگا ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہیں کہیں کسی چٹان کے گوشے میں فرعون سیتی اول کے دور کی ایک شہزادی اپنے زندہ جسم

اور جبین روح کے ساتھ سو رہی ہے — سو رہی ہے اور اپنے جگانے والے کا انتظار کر رہی ہے —" سوچتے سوچتے سلیم کو طرانی کی دستاویز پر بنی ہوئی شہزادی زلیخا کی تصویر یاد آ گئی — پھر وہ نیلی آنکھیں یاد آ گئیں، جو اس نے تغلق آباد کے کھنڈروں میں دیکھی تھیں —
اور پھر وہ سارے خواب یاد آ گئے جو اس نے شہزادی کے تصور میں دیکھے تھے — "ان خوابوں میں کوئی نہ کوئی ٹھوس حقیقت ضرور موجود ہے" — سلیم نے سوچا — "لیکن کیا یہ خواب ایک زندہ اور ناقابلِ تردید حقیقت بن سکیں گے —؟"

ابھی سلیم نے اپنے دل سے اپنے اس سوال کا جواب نہیں پایا تھا کہ اچانک فضا میں حسن اصغر کی تیز اور خوشی میں ڈوبی ہوئی آواز بلند ہوئی — "یہ دیکھیے — وہ عبارت جس کا دستاویز میں تذکرہ ہے"
طرانی نے اپنی بیٹری کی روشنی چٹان پر ڈالی — ہر شخص اس طرف جھک گیا — پتھر کی سطح پر قدیم مصری تحریر میں ایک عبارت نقش تھی — طرانی نے عبارت کا ترجمہ کرتے ہوئے کہا —
"یہی ہے وہ پتھر" — جس پر لکھا ہے "محوِ خواب جو بیدار کی جائیگی"
اور گویا سب کے سب لرز گئے —

ماسوا حسن اصغر کے — ہر ایک کے لیے یہ تصور ہی سوہانِ روح بن گیا کہ ان کے بالکل قریب اس چٹان کے اندر کسی کمرے میں ایک ممی تابوت میں دورِ گذشتہ کی ایک انتہائی حسین عورت گذشتہ ۳½ ہزار

"...کیا لکھے سو رہی ہے ۔۔ اور صرف اسکی منتظر ہے کہ کوئی اس کو بیدار کر دے"۔۔۔

ڈاکٹر بیگ توہمات کا قائل نہ تھا لیکن اس وقت ٹیلہ کے قریب کھڑے کھڑے اس نے بھی سوچا کہ اگر واقعی زلیخا زندہ ہے تو کیا عجب ہے کہ وہ بھوت بن چکی ہو، اس طرح روح کسی خبیث روح میں تبدیل ہو چکی ہو"۔۔۔ اور جیسے ڈاکٹر بیگ کے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور خود آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا اور وہ اپنی کیفیت چھپانے کے لیئے ایک پتھر کا سہارا لے لینے پر مجبور ہو گئے۔۔۔ خان بہادر عازم الدین، ارشد، طہرانی اور پارٹی کے دیگر تمام افراد۔۔۔ سب کے سب انہیں تاثرات سے دوچار تھے ۔۔۔ کسی انجانے ڈر اور خوف کی وجہ سے ہر شخص خاموش تھا، آنے والے واقعات کے تاریک پہلو ان کے ذہنوں میں انگڑائیاں لے رہا تھا۔۔۔ کیونکہ اگر کسی کو ہوش تھا تو وہ یہ ضرور دیکھتا کہ ۔۔۔ حسن اصغر ٹیلے سے ذرا ہٹ کر آسمان کی طرف ہاتھ بلند کر کے کہہ رہا ہے۔

"زلیخا ۔۔۔ اے مجبور و بیکس اور مظلوم شہزادی ۔۔۔ آخر کار تیری بیداری کا وقت آ ہی گیا ۔۔۔ اے میرے دوست کی لافانی محبوبہ اگر تو دیکھ سکتی ہے تو دیکھ لے کہ تیرا محبوب بھی تیرے جسم کے بالکل قریب ہی ہے ۔۔۔ ہزاروں سال گزر گئے نہ تیرے محبوب کے خدو خال میں فرق آیا اور نہ تیرے محبوب کے دوست میں متعدد دفعہ پیدا ہونے کے باوجود کوئی تبدیلی آئی"۔۔۔

اے سونے والی شہزادی اگر تو سن سکتی ہے تو سن ــــ!!! کہ اب وہ دن دور نہیں جب تیرا محبوب نوجوان احمس تیرے تابوت کے بالکل قریب کھڑا ہوگا، تیرا آخری رفیق گیتاری بھی تجھ سے باتیں کر رہا ہوگا اور تو ــــ جس نے اپنے محبوب کے حصول کے لیے اتنی بڑی قربانی دی تھی ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی ایک مرتبہ پھر جوانی، زندگی اور مسرت سے بھرپور انگڑائی لے گی ــــ"

حسن اصغر ــــ ابھی غالباً کچھ اور کہتا کہ اچانک آغائے تہرانی نے جو اس قسم کے کھنڈرات اور بعید از قیاس حوادث سے متعدد مرتبہ دوچار ہو چکا تھا اپنے ماتھے کا پسینہ پونچھا اور دھیمی لیکن مطمئن آواز میں کہا۔ "آخر کار ہم اس مقبرہ کے پوشیدہ پھاٹک کے قریب بلا کسی جد و جہد اور پریشانی کے پہونچ ہی گئے جس کا قدیم دستاویز میں تذکرہ تھا ــــ اسلیئے میرے دوستو اب ہراساں ہونے یا کسی خبیث روح کے تصور سے لرزاں ہونے کی ضرورت نہیں ــــ آج کا کام ختم ہوا آیئے اب واپس چلیں ــــ"

قافلہ کے افراد جس راستے سے آئے تھے اسی سے اپنی قیام گاہ واپس بھی لوٹ آئے ــــ لیکن اس رات کوئی فرد ایک لمحہ کے لیئے بھی نہ سو سکا ــــ

باب ـــــ ۱۱

اسی رات سوتے سوتے سلیم کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنے خیمہ میں سونے کے بجائے وادی بیگمات زعون میں ایک چٹان کے قریب کھڑا ہوا ہے۔ سلیم نے سوچا کہ شاید وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے لیکن جب اس نے خود کو اچھی طرح پرکھ لیا کہ وہ واقعی حالت بیداری میں ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس نے سوچا کہ وہ اپنے خیمے سے یہاں تک کیسے آگیا ـــ اور پھر اسے اپنے پُر اسرار دوست حسن اصغر کے یہ الفاظ بھی یاد آگئے۔ "سلیم ـــ یہ ہزاروں سال پرانی روحوں کا مسکن ہے آج کے بعد یہاں رات کو تنہا کبھی نہ آنا۔"

اور حسن اصغر کے یہ الفاظ یاد آتے ہی سلیم کانپ گیا ـــ ابھی وہ یہ ارادہ کر ہی رہا تھا کہ جلد از جلد اپنی قیام گاہ کی طرف واپس لوٹ کر اچانک

اس نے دیکھا کہ چٹان کے قریب ایک سفید سایہ ابھر رہا ہے ـــــ قریب تھا کہ خوفزدہ سلیم کے منھ سے ایک دلدوز چیخ نکل جاتی کہ بالکل خلاف توقع اس کے کانوں میں آواز آئی ــ "احمس ـــ یہ میں ہوں تمہاری محبوبہ زلیخا ـــ مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے ـــ"

یہ جملہ قدیم مصری زبانوں میں ادا کیا گیا تھا اور سلیم کو حیرت تھی کہ اس نے یہ زبان نہ جانتے ہوئے بھی اس جملہ کا مطلب کیسے سمجھ لیا ـــ؟

اے کاش سلیم کو معلوم ہو جاتا کہ ایسا سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟

اب سلیم یعنی احمس نے دیکھا کہ سفید پرچھائیں نے دھیرے دھیرے ایک انسان کی شکل اختیار کی ـــ خد و خال ابھرے ـــ لباس واضح ہوا، نیلی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی، سنہرے بال ہوا میں لہرائے ـــ اور پرچھائیں کی جگہ ایک مرمریں ترشیدہ جسم اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا ـــ۔

سلیم نے غور سے دیکھا ـــ زلیخا اس کے سامنے کھڑی تھی۔

وہ دیر تک حسن و خوبصورتی کے اس خاموش پیکر کو دیکھتا رہا ـــ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے چاند کی کرنوں نے عورت کا روپ اختیار کر لیا ہے ـــ ایک ایسی عورت کا روپ جس کا لباس بھی چاند کی روپہلی کرنوں سے بنایا گیا ہے ـــ۔

"احمس ـــ" ایک مرتبہ پھر فضا میں چڑیوں کی چہکار جیسی آواز گونجی، آواز بالکل نزدیک سے آئی تھی لیکن اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ

آواز دور بہت دور سے ماضی کے تمام پردوں کو چاک کرتی ہوئی، ہزاروں لاکھوں میل کا فاصلہ چشم زدن میں طے کرتی ہوئی آ رہی ہے ـــــ اور جیسے یہ آواز نہ ہو، کھلے ہوئے شاداب پھولوں کی بارش ہو جس نے پورے ماحول کو اپنی خوشبو سے معطّر کر دیا ہو ـــــ۔

"احمس ـــــ تم خاموش کیوں ہو ـــــ آؤ ـــــ میرے قریب آؤ ـــــ"

قدیم مصری زبان میں ایک مرتبہ پھر ایک نغمہ سا بکھرا ـــــ لیکن سلیم دم بخود رہا ـــــ وہ سلیم سے احمس میں تبدیل ضرور ہو چکا تھا لیکن اپنی شعوری کیفیات کی بیداری کی وجہ سے ابھی وہ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ اس وقت وہ خان بہادر عازم الدین کے بیٹے سلیم کے بجائے زلیخا کے محبوب احمس میں تبدیل ہو چکا ہے ـــــ۔

لیکن اس کے یہ احساسات بھی زیادہ دیر تک قائم نہ رہے، آہستہ آہستہ اسکی شعوری کیفیات ڈوبتی گئیں ـــــ۔ اور وہ زلیخا کی آواز کی موسیقی میں اس طرح کھو گیا کہ اسے گزرتے ہوئے وقت کی خبر نہ رہی، ـــــ زلیخا کی نیلی آنکھیں بدستور اسکی طرف دیکھ رہی تھیں ـــــ وہ آنکھیں جن میں ہزاروں سال کا دم توڑتا ہوا انتظار جھلک رہا تھا، ـــــ اور پھر جیسے ان پاک اور معصوم آنکھوں کے سحر نے سلیم کے ذہن کی تمام الجھنوں کو چاند چاند کی نرم اور شفاف کرنوں نے دھو دیا ـــــ۔

اب وہ بھی احمس تھا ـــــ سلیم کے بجائے احمس ـــــ جس کے جسم پر موجودہ دور کے شب خوابی کے لباس کے بجائے قدیم مصری لباس

بھی تھا۔۔۔

اور زلیخا کے ہونٹوں پر ایک میٹھی اور فاتحانہ مسکراہٹ ناچ اٹھی۔۔۔ اس نے مسحور کن انداز میں ایک ہلکی سی انگڑائی لی اور پھر احمس کے بالکل قریب آگئی۔۔۔

وقت ہمیشہ آگے کی طرف بھاگتا ہے لیکن آج قدیم مصر کی اس ہولناک وادی میں جب ہزاروں سال سے بچھڑی ہوئی روحوں کا ملاپ ہوا تو وقت پیچھے کی طرف واپس ہو چکا تھا۔۔۔ احمس اور زلیخا ایک دوسرے کے بالکل نزدیک تھے۔۔۔ اور ماضی حال اور مستقبل کا تمام فرق ختم ہو چکا تھا۔

ماحول کی رومان انگیزی۔۔۔ گردوپیش کی تنہائی اور جذبات کی وارفتگی کے تحت احمس نے چاہا کہ وہ زلیخا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہے کہ محبت سے خالی دل کے ساتھ وہ ہمیشہ پیدا ہوتا رہا اور اس کے انتظار میں موت کی وادی سے پرچھائیں کی طرح گذر کر ہمیشہ اس دنیا میں واپس آتا رہا لیکن اسے زلیخا نہ ملی۔۔۔ لیکن خلاف توقع زلیخا نے اس سے کہا۔۔۔ "میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہ کرو احمس۔۔۔ تم زلیخا کے جس جسم کو دیکھ رہے ہو وہ اس کا جسم نہیں اس کی روح کا عکس ہے۔۔۔ اور روح کو کسی خاص قوت ارادی کے تحت دیکھا تو جا سکتا ہے لیکن چھوا نہیں جا سکتا۔۔۔"

"پھر مجھے بتاؤ کہ تمہاری روح کی پرچھائیں کب تک میری آنکھوں

کو سوگوار بناتی رہے گی اور کب وہ وقت آئے گا جب ہماری روحوں کو اپنے اصل جسم میں واپس آنے اور ایک دوسرے سے ملنے میں کوئی مادی یا روحانی پابندی نہ ہوگی۔“ احمس نے اپنے جذبات پر قابو پا کر کہا —

”احمس — انتظار کے طویل لمحات اب ختم ہو چکے — اور وہ دن دور نہیں جب تم میرے مقبرہ کا زمین دوز دروازہ توڑ کر میرے سنگی تابوت کا ڈھکنا اٹھا رہے ہوگے۔ بس — یہی دن میری لمبی نیند کا آخری دن ہوگا — میں بیدار ہوں گی اور اس کے بعد — احمس — صرف تم ہوگے، میں ہوں گی، اس دنیا کی سرسبز و شاداب وسعتیں ہوں گی، پھول کی خوشبو ہوگی، زندگی کا رقص ہوگا، میرے اور تمھارے دل کی دھڑکنوں کی یکجائی ہوگی اور مستقبل ایک نہ ختم ہونے والے قہقہے میں تبدیل ہو جائیگا —

اس لیے احمس — مقبرہ کا دروازہ توڑنے کے لیے جلدی کرو — اب مجھ میں انتظار کی مزید قوت باقی نہیں رہی ہے — میری روح کی بےچینی اپنی انتہائی معراج پر پہونچتی جا رہی ہے اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے سنگی تابوت کے اندر میرا دم گھٹ کر رہ جائیگا۔“

”اطمینان رکھو زلیخا — تمھاری نیند کی مدت ختم ہو چکی۔“ احمس نے کہا — اور جیسے سفید پرچھائیں فضا میں بتدریج تحلیل ہونے لگی۔ — زلیخا کا روحانی وجود چاندنی کی کرنوں میں ضم ہونے

لگا۔۔۔ اور جب دور بہت دور سے آواز آئی۔۔۔ "میں جا رہی ہوں۔۔۔ میں جا رہی ہوں۔۔۔"

زلیخا چلی گئی، لیکن احمس دوبارہ سلیم میں تبدیل نہ ہوا۔

اب ماحول بالکل بدل گیا تھا، سرد اور اداس ہواؤں نے فضا کو غمزدہ کر دیا تھا، زلیخا کے جاتے ہی چاروں طرف ایک عجیب اداسی بکھر گئی تھی، کھجور کے جھومتے ہوئے درخت چاند کی کرنوں کی لوریاں سن کر سو گئے تھے۔۔۔ احمس بالکل خاموش کھڑا تھا۔۔۔ نہ سو رہا تھا، نہ جاگ رہا تھا۔۔۔ ماضی کے گمشدہ دن اور محبت میں ڈوبی ہوئی راتیں اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگیں۔۔۔ حد یہ کہ چاند کی روشنی پھیکی پڑنے لگی۔۔۔ اور پھر بالکل اچانک اس کے بالکل قریب ایک تیز بدبو پھیل گئی۔۔۔

"ابھی فضا میں خوشبو تھی، ہواؤں میں مہک تھی لیکن ابھی پلک جھپکنے میں یہ بدبو کیسی پھیلی۔۔۔" احمس نے سوچا اور ابھی وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا تھا کہ اس نے دیکھا۔۔۔ اس کے قریب ایک اور سایہ ابھر رہا ہے، ۔۔۔ لیکن اف یہ سایہ زلیخا کے برعکس کتنا بھیانک، ۔۔۔ کتنا ہیبتناک اور کتنا لرزہ خیز تھا۔۔۔ مضبوط دل والا احمس بھی اس سایہ کو دیکھ کر ڈر گیا۔۔۔

"میں اسپاتا ہوں۔۔۔ زلیخا کا منگیتر۔۔۔ وہ جس سے شہزادی کو نفرت تھی، ۔۔۔ وہ جو شہزادی کے حسن کا دیوانہ تھا۔۔۔ اور وہ جس کی منگنی کا اعلان خود فرعون سیٹی اول نے کیا تھا۔۔۔"

"میں سمجھ گیا ۔۔۔ لیکن تم مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو ۔۔۔؟"

"اس لیے آیا ہوں کہ جہاں تم زلیخا کی بیداری کا انتظام کر رہے ہو وہاں اس کے لیے بھی تیار رہو کہ تمھیں مجھ سے مقابلہ کرنا ہے۔۔۔۔ مجھ سے ۔۔۔ یعنی اسپاتا سے ۔۔۔ جو ہر حال میں زلیخا کو حاصل کر کے رہیگا ۔۔۔ اس لیے کہ وہ فرعون کے اعلان کا احترام کریگا ۔۔۔"

احمس ۔۔۔ تم یہ نہ سمجھنا کہ اسپاتا مر چکا ہے ۔۔۔ اگر زلیخا زندہ ہے، اگر احمس زندہ ہے تو اسپاتا بھی باقی ہے ۔۔۔ اسکا ارادہ بھی باقی ہے اور اس کی منگنی بھی باقی ہے ۔۔۔

۔۔۔ بس یہی کہنے کے لیے میں یہاں وادی میں آیا تھا ۔۔۔ اور اب آخری انتباہ کے بعد دوبارہ اپنی لحد میں واپس جا رہا ہوں ۔۔۔"

احمس کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ سایہ بھی فضا کی لامحدود وسعتوں میں تحلیل ہو گیا ۔۔۔ اب وہ پھر تنہا تھا ۔۔۔ لیکن نرم ہوا کے جھونکے بدستور اس کے چاروں طرف رقص کر رہے تھے ۔۔۔

دفعتاً احمس نے محسوس کیا کہ وہ ایک گہرے اور تاریک غار میں گرتا جا رہا ہے ۔۔۔ دھند کی ایک دبیز چادر اس کو اپنے چاروں طرف لپیٹتی جا رہی ہے ۔۔۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں ۔۔۔ اور پھر جیسے کسی مضبوط ہاتھ نے اس کو سنبھال لیا ہو ۔۔۔

اور یہ ہاتھ اس کے دوست حسن اصغر کا تھا ۔۔۔ جو اس کو صبح ہونے کے بعد جگا رہا تھا ۔۔۔ سلیم نے اپنے پلنگ پر لیٹے لیٹے آنکھیں کھولیں ۔۔۔

——رات کے تمام واقعات اس کو اب تک یاد تھے۔ اس نے چاہا کہ وہ حسن صغر کو سب کچھ بتا دے۔— لیکن قبل اس کے کہ اسکی زبان سے ایک بھی لفظ نکلتا حسن اصغر خود ہی بول اٹھا——

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو——۔ اس لیے تم اپنی زبان نہ کھولو—— تمھیں یہ سن کر ذرا اتنی حیرت ہو گی کہ رات کو جب تم سلیم کے بجائے احمس تھے—— میں بھی تمھارے ساتھ تھا——"

"تم میرے ساتھ تھے——؟" سلیم نے ڈر اور خوف کی وجہ سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ہاں—— یقین کرو سلیم—— جب سے تم نے سرزمین مصر پر قدم رکھا ہے میں ہر وقت تمھارے ساتھ رہتا ہوں،—— تمھاری خبر گیری کرتا رہتا ہوں اس لیے کہ لاشعوری طور پر ہم دونوں کا مقصد ایک ہے——"

"کونسا مقصد——؟ حسن اصغر—— پچھلے کئی دن سے میں محسوس کر رہا ہوں کہ تم ہر بات "معمہ" میں کرتے ہو——"

"زلیخا کی بیداری ہم دونوں کا مشترک مقصد ہے——۔ لیکن جہاں تک "معمہ" کا تعلق ہے اگر کل رات تم نے مجھے دیکھ لیتے تو شاید سمجھ جاتے کہ نہ میں کوئی "معمہ" ہوں اور نہ میری گفتگو میں کوئی "معمہ" ہے——۔ بہر حال جلد تیار ہو جانا—— آج یہاں کے کھنڈرات کی سیر کرنے چلیں گے۔"

حسن اصغر یہ کہہ کر چلا گیا لیکن سلیم کی الجھنیں بدستور باقی رہیں وہ سوچتا رہا—— "زلیخا کی بیداری ایک ہیبتناک اسرار کیوں بنتی جا رہی ہے،

حسن اصغر میرے وجود میں اتنی غیر معمولی دلچسپی کیوں لے رہا ہے ـــ میں
آواگون کا قائل نہیں ـــ پھر زلیخا مجھے اتنی کیوں الجھتی ہے ـــ جب سے
میں مصر آیا ہوں مصر کے ماضی میں کیوں دلچسپی لے رہا ہوں ـــ مصر کی
تاریخ اور اس کے کردار مجھے جانے پہچانے کیوں نظر آرہے ہیں"

ایسے ہی ہزاروں سوال تھے جو ایک بھنور کی طرح سلیم کے ذہن
میں ابھرتے اور ڈوب جاتے ـــ لیکن مسئلہ پر ہر طرح سے روشنی ڈالنے
کے باوجود سلیم کو کنارہ نہ ملا ـــ۔

ابھی سلیم نہا دھو کر تیار ہی ہوا تھا کہ آقائے طہرانی، ناظم الدین
اور حسن اصغر پارٹی کے دیگر افراد کے ساتھ اس کے خیمے میں آ گئے ـــ
پروگرام یہ بنا تھا کہ آج دن کی روشنی میں ہی مقبرہ کے اطراف کا معائنہ
کر لیا جائے تاکہ بعد میں کھدائی کے وقت کسی دقت کا سامنا نہ کرنا
پڑے ـــ۔

پارٹی کے تمام افراد کا کہنا تھا کہ خلاف توقع پہلی ہی رات کو شہزادہ
کا مقبرہ مل جانا مہم کے لیے ایک نیک شگون ہے اس لیے اب مزید اقدامات
کے سلسلے میں وقت برباد نہ کیا جائے ـــ طہرانی نے آج تین مزدور
بھی ساتھ لے لیے تھے ـــ اور خلاف معمول آج وہ اپنے کاندھے پر
ایک بندوق بھی لٹکائے ہوئے تھا ـــ۔

ٹھیک ۱۰½ بجے دن کو پارٹی زلیخا کے مقبرہ کی طرف روانہ ہو گئی،
تقریباً ایک گھنٹے کے بعد وہ ایک وسیع شاہی قبرستان کے کھنڈروں سے

گذرے جہاں مصر قدیم کے شہنشاہ، بیگمات، حکمار، اور کاہن آبائے سلف کی تہذیب، تمدن اور تاریخ کو لیے ہوئے ابدی نیند سو رہے تھے، ایک ایسی تہذیب جس کا دعویٰ آج کے ان ویرانوں نے ہزاروں سال پہلے جب کیا تھا جب پوری دنیا پر جہالت کے تاریک پردے پڑے ہوئے تھے۔

ہر طرف غضب کی خاموشی اور سناٹا طاری تھا۔

دفعتاً عازم الدین نے طہرانی سے پوچھا "— طہرانی — تمہارے خیال میں شہزادی کے سنگی تابوت تک پہونچنے میں کتنے دن صرف ہونگے"

"کچھ نہیں کہا جا سکتا — کیونکہ اس کا انحصار پتھروں کی کھدائی اور کٹائی پر ہوگا — اگر پتھر مضبوط ہوئے اور مسالہ سخت ہوا تو ممکن ہے کہ ہمیں ایک ہفتہ لگ جائے، دوسری بات یہ کہ ہمیں مقبرہ کے اندر کی عمارت اور اسکی ساخت کا کوئی اندازہ نہیں — ہمیں یہ تک نہیں معلوم کہ مقبرہ کے داخلی دروازہ کے بعد راستہ صاف ہے یا نہیں — اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ داخلی دروازہ کے بعد بھی اصل مدفن تک پہونچنے کے لیے کئی مضبوط دروازے توڑنا پڑتے ہیں — ایسی صورت میں دشواریاں اور بھی بڑھ جاتی ہیں —"

حسن اصغر نے بھی طہرانی کی بات سنی تھی — اس نے چاہا کہ وہ بات کو آگے بڑھائے اور پارٹی کے تمام افراد کو یقین دلائے کہ مقبرہ کا داخلی دروازہ توڑنے کے بعد شہزادی کے سنگی تابوت تک پہونچنے

میں کوئی دشواری نہ ہو گی لیکن نہ معلوم کیا سوچ کر وہ خاموش رہا۔ البتہ ایک فاتحانہ مسکراہٹ اس کے لبوں پر ضرور پھیل گئی۔

اب دھوپ بڑھ گئی تھی اور گرمی کی شدت نے سب کو پریشان کر دیا تھا چنانچہ طہرانی کے مشورہ پر یہ قافلہ ایک جگہ آرام کرنے کے لیے ٹھہر گیا۔ اس جگہ سے ایک مسمار شدہ مقبرہ کے کھنڈر بالکل صاف نظر آرہے تھے۔ طہرانی نے ان کھنڈروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "فرعون کا نام لیتے ہی ہمارے ذہن میں ایک ظالم، جابر، سنگدل اور ملحد کردار ابھر آتا ہے لیکن غالباً بہت کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہے کہ متعدد فرعون بہت ہی نیک دل اور شائستہ کردار کے حامل تھے۔ مثلاً۔ یہ سامنے والے کھنڈر جس فرعون کے مقبرے کے ہیں وہ دیانت، صداقت، انصاف، سادگی، اخلاص اور انسانیت نوازی کا زندہ مجسمہ تھا"

طہرانی نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیکر اپنی بات دوبارہ شروع کی۔ "اس فرعون کا نام اخناتون تھا اور قدیم تاریخ کے اندازے کے بموجب حضرت موسیٰ کی پیدائش سے تقریباً اسی برس قبل اسکا انتقال ہوا تھا۔ عام فراعنہ کے بالکل برعکس اخناتون موحد تھا۔ یہ فرعون قدیم تاریخ کا پہلا شہنشاہ ہے جس نے حکومت کی پالیسی اور اپنے آباؤ اجداد کی روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے خود کو خدا کہلوانے کے بجائے مصر کی اصنام پرستی کی زبردست مخالفت کی اور

توحید کا نعرہ بلند کر کے مصری عوام کو ایک نیا فلسفہ اور ایک نیا انداز فکر دیا ــــ

"اخناتون" صرف ۱۷ سال حکومت کرنے کے بعد محض ۳۸ سال کی عمر میں مر گیا لیکن اس کے دورِ حکومت میں دنیا کی تاریخ میں جو اہمیت حاصل ہے وہ دنیا کے چند ہی حکمرانوں کے ادوار کو نصیب ہو سکی ہے، اس موحد فرعون سے قبل ہر فرعون کو "را" یعنی سورج دیوتا کا ارضی بیٹا سمجھ کر پوجا جاتا تھا اور مصریوں کے مذہب پر لاتعداد دیوی دیوتا مسلط تھے ــــ چنانچہ جب "اخناتون" بھی تخت پر بیٹھا تو اس کی بھی پرستش کی گئی ــــ

میں اخناتون کا یہ قصہ محض وقت گزاری کے لیے نہیں سُنا رہا ہوں بلکہ اس لیے بتا رہا ہوں کہ اس کا تعلق شہزادی زلیخا سے بھی ہے۔

بچپن ہی سے "اخناتون" کا معصوم ذہن مصر کے ان گنت خود ساختہ خداؤں سے بھٹک کر خالقِ حقیقی کی تلاش میں بے چین رہتا تھا ــــ کمسن فرعون زادہ مہکتے چمن زاروں میں گھنٹوں پرندوں کے نغمے سنتا، سورج کو نکلتے اور ڈوبتے دیکھتا ــــ اور پھر دل ہی دل میں سوچتا کہ ان تمام چیزوں کی تخلیق کسی انسان کی قوت میں ممکن نہیں ــــ

"اخناتون" کا باپ فرعون امخوطب سوئم نے جو یہ خبریں سُنیں تو اس نے گوتم بدھ کے باپ کی طرح یہی حل نکالا کہ کمسنی ہی میں بیٹے

کی شادی کردی جائے ــــ چنانچہ اس نے "متانی"[1] کے آریائی حکمران "دشرتا" کو پیغام دیا کہ وہ اپنی بیٹی "تادوخیپا" کی شادی اس کے لڑکے سے کردے۔ دشرتا نے فوراً یہ رشتہ قبول کر لیا ــــ اور اپنی دس سالہ لڑکی "تادوخیپا" مصر روانہ کردی۔ جہاں سب سے پہلے اسکا مذہب تبدیل کر کے اس کا نام "نفرتیتی" رکھا گیا اور پھر اخناتون سے اسکی شادی کردی گئی ــــ ابھی اس ایشیائی مصری بیاہ کے شادیانے فضاء میں گونج ہی رہے تھے کہ اخناتون کے باپ کا انتقال ہو گیا اور پجاریوں کے متفقہ فیصلہ کے بعد اسے فرعون بنا کر تخت پر بٹھا دیا گیا ــــ لیکن جلد ہی مصر کے طاقتور کاہنوں کو محسوس ہو گیا کہ ان کا نیا فرعون ان کی نظریات اور مذہبی کسوٹی پر پورا نہیں اترتا ــــ

اخناتون ــــ گیارہ سال کی عمر میں تخت پر بیٹھا اور محض چھ سال کے بعد ایک دن اس نے خداوندی سے متعلق تمام مصری نظریے ٹھکرا کر ایک اَن دیکھے خدا کا نظریہ پیش کر دیا ــــ اور اپنے اس خدا کی تبلیغ کے لیے اس نے اپنی تمام قوت صرف کر دی۔ پورے ملک میں "آمن" کی پرستش بہ جبر ختم کر دی گئی۔ پجاریوں کے تمام اختیارات، وسائل، اوقاف اور وظائف ضبط کر لیے اور "شیبہ" میں اپنے اس اَن دیکھے خدا کی عبادت کے لیے ایک عظیم الشان مندر بنوا دیا۔ جو آج بھی تاریخ

---

[1] متانی ــــ موجودہ عراق اور ایران کے درمیان ایک آزاد آریائی ملک تھا۔ جس سے مصر کے دوستانہ تعلقات تھے۔

میں "جم آتن ام پرتن" کے نام سے مشہور ہے۔

پجاریوں کی قوت اور مذہبی طاقت کو ختم کرنے کے لیے اس نے موجودہ قاہرہ سے ۱۶۰ میل دور ایک نئی راجدھانی تعمیر کرائی اور اسکا نام "آختت اتن" رکھا ــــ آفتاب پرستوں کے اس فرعون نے اپنی نئی راجدھانی میں آکر اعلان کیا کہ آفتاب بھی کوئی نہ کوئی مادّہ ہے اس لیے وہ خدا نہیں ہو سکتا ــــ اس نے کہا کہ سورج خدائے برحق کی ایک عظیم تخلیق کے سوا اور کچھ نہیں ہے ــــ اور وہ ہم سب کا خالق تمام مادی خواص سے مبرا ہے ــــ

اخناتون نے اپنے اس خدا کی مزید وضاحت کی اور کہا کہ میرا خدا زمان ومکان کی قید سے بالاتر ہے، مادی قیود اور خواہشات سے آلودہ نہیں ہے، وہ کسی خاص ملک، فرقے یا قوم کے لیے مخصوص نہیں ہے، اور نہ اسکا جسم انسانی اور حیوانی اعضا سے مرکب ہے" اس نے ایک دن تمام پجاریوں کو بلا کر کہا کہ "میرا خدا دنیا کی تمام بڑی سے بڑی قوتوں سے بالاتر اور رب العالمین ہے ــــ وہ آفرینش کائنات سے پہلے بھی تھا اور ہمیشہ لاشریک اور تنہا رہیگا ــــ اسکی رحمتیں ہمیشہ سے جاری ہیں اور ہمیشہ جاری رہیں گی ــــ وہ گورے کالے خطاکار اور معصوم، مصری اور غیر مصری میں کوئی امتیاز نہیں رکھتا ــــ ہر ذی حیات کی تمام ضروریات وہ بلا کسی تفریق کے پوری کرتا ہے"ــــ

ط۔ آج کل آختت اتن ــــ طل العمرنہ کے نام سے مشہور ہے۔

اور سب اس کے لطف و کرم میں برابر کے شریک ہیں۔

طرانی نے گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے کہا کہ "اس سے قبل تاریخ انسان کے کسی مفکر نے ایسے معبود کا نظریہ نہیں پیش کیا تھا۔ چنانچہ طاقتور کاہنوں نے اس کے اس خدا کو تسلیم نہیں کیا اور اندر ہی اندر بغاوت کی چنگاریاں سلگنے لگیں۔ تمام سردار اور امراء اس سے برگشتہ ہو گئے۔ خاندان کے تمام افراد کی آنکھوں میں اس کے خلاف نفرت کی آگ ابل پڑی۔ اور اخناتون بالکل تنہا رہ گیا۔ صرف اس کی وفادار اور محبوب بیوی نفرتیتی تھی جو اپنی چھ لڑکیوں کے ساتھ آخر وقت اپنے شوہر کی غمگسار اور دمساز بنی رہی۔

اور ایک دن اچانک اخناتون پر مرگی کا شدید دورہ پڑا اور وہ مر گیا۔

اخناتون کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ تمام بیٹیوں کی شادی اس کے مرنے کے بعد اس کی بیوی نے کر دی۔ البتہ اس کی ایک لڑکی "میاتن" کی شادی نہ ہو سکی۔ ماں کے مرنے کے بعد میاتن نے اپنی شادی ایک شامی تاجر سے کر لی۔ اور اس طرح ایک نئے خاندان کی بنیاد پڑ گئی۔ جس کا تعلق مصر کی شہنشاہیت سے بالکل نہ تھا۔

شہزادی زلیخا اسی "میاتن" کی نسل سے تھی اور اسی لیے بے حد خوبصورت تھی کہ اس میں شامی خون بھی شامل تھا۔ سیتی اول کے دور میں بھی زلیخا شاہی خاندان کے ہوتے ہوئے بھی شاہی خاندان

کی نہیں سمجھی جاتی تھی۔۔ بظاہر اسکا کوئی ہمدرد نہ تھا۔ فرعون کا میرعمارت اور مجسمہ ساز "حورم حب" چونکہ دل ہی دل میں باطنی طور پر اخناتون کے مذہب کا پیرو تھا اس لیے وہ زلیخا سے ہمدردی رکھتا تھا ۔۔ اسی "حورم حب" نے شہزادی کے مقبرہ کا نقشہ بنایا اور بذات خود مقبرہ کی تعمیر میں حصّہ لیا ۔۔ اس لیے میرے اندازے کے بموجب مقبرہ بیحد مضبوط اور ناقابل شکن ہوگا۔ اور اس کی کھدائی میں زیادہ دقت ضرور صرف ہوگی۔۔

طہرانی یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

حسن اصغر نے چاہا کہ وہ طہرانی سے کہے کہ ایک مرتبہ داخلی دروازہ کی کھدائی کے بعد وہ ایک بہترین رہبر کی حیثیت سے پوری پارٹی کو شہزادی کے سنگی تابوت تک بہ آسانی پہونچا دیگا ۔۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنی زبان خاموش رکھی، وہ جانتا تھا کہ پارٹی کے تمام افراد اس کو مافوق الفطرت سمجھ کر اس کی طرف سے مشکوک ہیں اور اس کا یہ جملہ اس کو اور بھی زیادہ مشکوک بنا سکتا ہے اسلیئے وہ خاموش ہی رہا۔۔۔

تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد قافلہ پھر روانہ ہوا اور تقریباً $1\frac{1}{2}$ گھنٹے کی مسافرت کے بعد پھر اسی جگہ پہونچ گیا جہاں $3\frac{1}{2}$ ہزار برس سے ایک پتھر پر یہ تحریر نقش تھی۔۔۔

"محو خواب جو بیدار کی جائے گی"

نگرانی کے حکم پر مزدوروں نے ایک پتھر پر کھدائی کے لیے اپنا پہلا بیلچہ مارا اور کھدائی شروع ہو گئی۔ — حسن اصغر کے جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ خود بھی کدال کے ذریعہ پتھر ہٹا رہا تھا۔

—— ∘ ═ ∘ ═ ∘ ——

باب ـــــــــ ۱۲

دوپہر کا کھانا کھائے بغیر پارٹی کے تمام افراد ٹیلے کے پتھروں کو ہٹاتے رہے، اور تقریباً تین بجے انھیں ایک سنگی دروازہ نظر آگیا ـــ اور ہر شخص کی ہمت بڑھ گئی ـــ۔

”بس ـــ یہی وہ داخلی دروازہ ہے جس کو توڑ کر ہم مقبرہ کی اصل اندرونی عمارت میں داخل ہو جائیں گے ـــ“ حسن اصغر نے چیخ کر کہا۔

”کیا تم یہ بات بالکل یقین سے کہہ رہے ہو ـــ“ طرانی نے مشکوک لہجے میں کہا۔

”ہاں ـــ بالکل یقین کے ساتھ ـــ“ حسن اصغر نے فوراً جواب دیا۔

”کس بنیاد پر ـــ“ طرانی کا شک بدستور باقی تھا،

"یہ ایک لمبی کہانی ہے ــــ فی الحال میں یہی التجا کرونگا کہ میری ہر بات پر یقین کیا جائے اس لیے کہ زلیخا کی زندہ لاش تک پہونچنا صرف آپ سب کا ہی نہیں میرا بھی مقصد ہے ــــ"۔

"لیکن کیوں ــــ ؟ عازم الدین نے پوچھا۔

"اس کا جواب آنے والا وقت ہی دیگا ــــ"۔

اس مرتبہ حسن اصغر کی آواز میں لوچ اور نرمی نہ تھی ــــ بدلی ہوئی گرجدار آواز اور اسکی سختی نے عازم الدین اور طہرانی دونوں کو خاموش کر دیا، اور دروازہ توڑنے کے لیے مزدوروں کو اشارہ کر دیا گیا۔

شام تک کوشش ہوتی رہی لیکن حد درجہ کوشش کے باوجود دروازہ کا ایک بھی پتھر نہ توڑا جا سکا ــــ اور کام کل تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔ دوسرے دن مزدوروں کی ایک بڑی تعداد کے ساتھ کام دوبارہ شروع ہوا ــــ لیکن اس مرتبہ کھدائی کی نوعیت بدل دی گئی ــــ آج مزدوروں کی ایک جماعت داخلی دروازہ کے توڑنے پر اور دوسری جماعت کوئی دوسرا دروازہ تلاش کرنے کے لیے متعین کر دی گئی ــــ پہلی ٹولی کا نگراں طہرانی تھا اور دوسری کا حسن اصغر ــــ کام بڑی مستعدی سے ہوتا رہا ــــ

حسن اصغر جس ٹولی سے کام لے رہا تھا اس نے ٹیلہ کے مغربی جانب کھدائی شروع کی تھی ــــ سب سے پہلے منتشر پتھر ہٹائے گئے اور پھر ان پتھروں کو

توڑا گیا جو ہزاروں برس سے ایک جگہ پڑے رہنے کی وجہ سے بالکل جم کر رہ گئے تھے۔ اور جب ان پتھروں کو توڑ کر ملبہ ہٹایا گیا تو چٹان میں ایک جگہ ایک بڑا شگاف نظر آیا۔ حسن اصغر کے چہرے پر شگاف کو دیکھتے ہی مسرّت کی لہریں پھیل گئیں۔ اس نے مصری زبان میں مزدوروں کو خاموش رہنے اور اپنی جگہ کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور خود شگاف میں داخل ہو گیا۔

طہرانی اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو جو داخلی دروازے کو توڑنے کی جدوجہد کر رہے تھے معلوم ہی نہ تھا کہ حسن اصغر مقبرہ کی چہار دیواری میں داخل ہو چکا ہے۔ وہ اپنے کام میں مشغول رہے اور حسن اصغر شگاف کے اندر اپنے قدم بڑھاتا رہا۔ تنہا لیکن دل میں حوصلوں اور امنگوں کا ایک طوفان سا چھپائے ہوئے۔

لیکن تقریباً بیس فٹ چلنے کے بعد راستہ مسدود ہو گیا۔ آگے پتھر کا ایک اور بڑا دروازہ تھا اور شگاف جس سُرنگ نما راستہ میں ہوا تھا اس کی چھت بیٹھ گئی تھی۔ کافی دیر تک حسن اصغر اس جگہ کھڑا ہو کر کھدائی کی نوعیت پر غور کرتا رہا۔ اور اس کے بعد واپس آگیا۔

"اگر جا بجا اسی طرح عمارت کا اندرونی حصہ بیٹھ گیا ہے تو سنگی تابوت تک پہونچنا بجید دشوار ہے۔" حسن اصغر نے سوچا اور پھر جیسے اسکا دل بھر آگیا۔

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ جس کمرے میں زلیخا کا تابوت رکھا ہوا ہے

اس کی بھی چھت گر گئی ہو۔" اور حسن اصغر شگاف سے باہر نکل آیا۔ اسکا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔

اسی طرح کئی دن کام ہوتا رہا۔ سخت محنت اور مشقت کی ساعتیں گذرتی رہیں۔ گرمی سے دہکتے ہوئے دن اور خاموش ٹھنڈی راتیں ختم ہوتی رہیں۔ روشنی کی کمی اور کھنڈر کے اندر ہوا کی خرابی کی وجہ سے حالت بد سے بد تر ہوتی گئی۔ مزدوروں کو آرام نہیں ملا اس لیے کھدائی کے کام کی رفتار بھی سست پڑ گئی۔ حسن اصغر مزدوروں کی ایک قلیل جماعت کے ساتھ اسی راستہ کو صاف کرتا رہا جہاں سرنگ کی چھت بیٹھ گئی تھی، اور بھاری پتھر کے اسی بڑے دروازے کو منہدم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن مسلسل ایک ہفتہ کی جدوجہد کے بعد بھی کسی کو کامیابی نہ ہوئی۔ سیٹھ اول کے معمار "حورم حب" کے اس تعمیری شاہکار کو شکست نہ دی جا سکی اور سخت محنت و جفاکشی کے بعد بھی کوئی حوصلہ افزا بات نہ ہو سکی۔

پارٹی کا ہر شخص پریشان تھا لیکن سب سے زیادہ پریشانی حسن اصغر کو تھی۔ اور سلیم — اس کی یہ حالت تھی کہ وہ گھنٹوں محویت کے عالم میں مقبرہ کے قریب کھڑا رہتا، مزدوروں کی کدالیں چلتی رہتیں، بیلچوں کی آواز بلند ہوتی رہتی، پھاوڑے پتھروں سے ٹکراتے رہتے۔ فضا میں ایک ہنگامہ سا برپا رہتا۔ سورج نکلتا۔ پھر شباب پر آتا۔ زوال پر آتا اور تاریکی کی آغوش میں سما جاتا۔ لیکن کسی کو اس کا ہوش

رہا تھا۔ ہر ایک کی نگاہ کے سامنے صرف زلیخا تھی، اس کا سنگی تابوت تھا، اس کی ہزاروں سال پرانی نیند تھی، اس کی بیداری تھی اور وہ تجربہ تھا جس کا ارمان لیکر خاندان فراعنہ کا آخری فرعون تک اپنے تابوت میں سو گیا تھا۔

تمام رات حسن اصغر بےچین رہتا، اپنے خیمے میں ٹہلتا رہتا، سوچتا رہتا، الجھن کھاتا رہتا۔ اور یا پھر اپنے خیمے سے باہر آکر خلا میں گھورتا رہتا، جیسے فضا کی بلندیوں میں آسمان کی وسعتوں میں، ستاروں کی جھرمٹ میں، چاند کی رقص کرتی ہوئی کرنوں میں کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ کچھ پوچھنے کے لیے، کچھ دریافت کرنے کے لیے۔

اور اسی طرح صبح ہو جاتی۔

طرانی عازم الدین سے کہتا "خان بہادر صاحب ۔۔۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، اگر داستان دیرینہ سچی ہے، اگر مصر کی تاریخ دیانتداری کی بنیاد پر لکھی گئی ہے، اگر سیتی اول واقعی وہ فرعون تھا جس کا تذکرہ ماضی کے گمشدہ اوراق میں ملتا ہے، اگر اس وادی میں بکھرے ہوئے پتھروں کے آنسو سچے ہیں تو ہمیں اپنے مقصد میں کامیابی ضرور ہوگی اور ہم نہ صرف زلیخا کے سنگی تابوت تک پہونچیں گے بلکہ اس کو بیدار بھی کرلیں گے۔ عازم الدین میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ مقبرہ اور اسکی آسیبی وادی ہمارے ہی ہاتھوں سے ٹوٹیں گی۔"

ڈاکٹر بیگ تھک گیا تھا اور اس کے حوصلے تقریباً پست ہو گئے تھے

لیکن پھر بھی وہ پُر امید تھا۔ وہ کہتا "مقبرہ کے اندر زلیخا ضرور سو رہی ہے۔ میں سب کچھ مان سکتا ہوں لیکن یہ نہیں مان سکتا کہ ہم غلط راستہ پر چل رہے ہیں یا ماضی کی کسی گمشدہ پرچھائیں نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔"

اور بوڑھا عازم الدین ٹھنڈی سانس لیکر کہتا۔ "جب تک میرے سرمائے میں آخری پائی بھی باقی ہے یا جب تک میرے جسم میں زندگی کی آخری سانس بھی باقی ہے میں زلیخا کو بیدار کر کے رہونگا اس لیے کہ اگر زلیخا بیدار نہ ہوئی تو میرا سلیم دیوانہ ہو جائیگا۔ خدا کی قسم میں دن میں کئی بار سلیم کی آنکھوں میں زلیخا کی تصویر دیکھتا ہوں اور پھر ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے سلیم تمام رات شہزادی کی نیلی آنکھوں کے انتظار میں جاگتا رہا ہے۔"

ایک دن شام تک ناکام کھدائی کے بعد ڈاکٹر بیگ نے طہرانی سے کہا "میرا قیاس ہے کہ مقبرہ میں ایک کے بعد ایک کئی چہار دیواریاں ہونگی۔ پہلی چہار دیواری کا مغربی حصہ جس طرف حسن اصغر کھدائی کر رہا ہے گر چکا ہے۔ جس کے ملبہ نے ہمارا راستہ بند کر دیا ہے اور دوسری چہار دیواری کے پتھر اتنے بڑے ہیں کہ ہم ان کو نہیں کاٹ سکتے۔"

"پھر کیا کیا جائے۔ پتھر دن کو بہر حال کاٹنا ہے۔" طہرانی نے کہا۔

"کیوں نہ ہم دوسری چہار دیواری کا ایک حصہ بارود سے اڑا دیں۔" ڈاکٹر بیگ نے اچانک رائے دی۔

"لیکن اس طرح اس کا بھی تو امکان ہے کہ پورا مقبرہ گر جائے اور سوتی ہوئی شہزادی دب کر ہلاک ہو جائے"

"نہیں ڈاکٹر صاحب — ہم شہزادی کے تابوت تک پہونچنے کیلئے کوئی نہ کوئی راستہ ضرور تلاش کر لیں گے۔ ہمیں نا امید ہونیکی ضرورت نہیں —" طہرانی نے پوری سنجیدگی اور متانت سے کہا —

حسن اصغر نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس پر جیسے سکوت سا طاری تھا۔ لیکن جب طہرانی نے اس سے بھی رائے مانگی تو اس نے خیمے سے باہر جاتے جاتے کہا — "آج رات آپ اطمینان سے سویئے — حسن اصغر آپ سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ کل دوپہر تک مقبرہ کا کوئی نہ کوئی دروازہ ضرور کھول دیگا —"

حسن اصغر یہ ڈرامائی جملہ کہہ کر خیمے سے باہر چلا گیا اور تمام لوگ ایک عالم وجد میں دیر تک حسن اصغر کے تھکے تھکے قدموں کی آواز سنتے رہے۔

رات کے کھانے پر بھی حسن اصغر موجود نہیں تھا، ہر شخص نے اسکی عدم موجودگی پوری شدت کے ساتھ محسوس کی لیکن کسی نے بھی ایک انجانے خوف کے تحت اس کے بارے میں عملہ کے کسی فرد سے کچھ بھی دریافت نہ کیا۔

سب سو گئے لیکن سلیم جاگتا رہا اور صرف یہ سوچتا رہا کہ آخر اسکا اجنبی مصری دوست کہاں گیا ہے۔ حسن اصغر اس کا دوست!

اجنبی ہونے کے باوجود اس کا برسوں کا رفیق، مدتوں کا ساتھی۔

چنانچہ اس کی بےچینی بڑھتی گئی، حد یہ کہ وہ بھی خیمہ سے باہر نکل آیا۔

رات تاریک تھی لیکن مدھم چاند کی روشنی نے اندھیرے اجالے کی امتزاجی کیفیت پیدا کر رکھی تھی۔ چند لمحات سلیم اپنے خیمہ کے باہر کھڑا وادی کے پر ہول سناٹے کی طرف دیکھتا رہا اور اس کے بعد غیر ارادی طور پر ایک طرف روانہ ہو گیا۔ سلیم جس راستہ پر چل رہا تھا وہ کبھی اوپر کی طرف جاتا تھا اور کبھی نیچے کی طرف، انتہائی پیچ در پیچ اور ناہموار راستے سے گزرتا ہوا وہ آخر کار اس درہ میں داخل ہو گیا جو وادی میں مقبرہ سے کچھ فاصلہ پر ایک بلند چٹان پر ختم ہوتا تھا۔ کھنڈرات کی اس وادی میں یہ چٹان کسی دیو کی کھوپڑی کی طرح بالکل بے ہموار تھی۔

سلیم نے چٹان کی چوٹی پر کھڑے ہو کر دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں دور دور تک حسن اصغر کا کوئی پتہ نہ تھا۔

حد نظر تک چاندنی رات کا منظر بےحد دلکش تھا، راستہ رات کی تاریکی میں غائب ہو چکا تھا، ابھری ہوئی چٹانیں پہریداروں کی طرح سر اٹھائے ہوئے کھڑی تھیں، تیز ہوا سائیں سائیں کرتی آتی ہوئی اس طرح چل رہی تھی گویا بھوتوں کا کوئی رقص ہو رہا ہو، کھجور کے درخت مستانہ وار جھوم رہے تھے۔ ہزاروں برس پرانی اس قدیم میں جہاں کبھی شامی، یونانی، بابلی اور ایشیائی غلاموں نے اپنے آقاؤں

کی خوشنودی کے لیے موت کی آخری ہچکی تک کام کیا تھا اور تحیر زا عماروں کی بنیاد رکھی تھی ــــــ دور دور تک کسی ذی روح کا پتہ نہ تھا ــــــ سلیم دیر تک زمانے کے اس بدلتے ہوئے روپ کا عکس دیکھتا رہا، اور سوچتا رہا کہ اس میں، اور اس سلیم میں کتنا فرق ہے جو نئی دہلی کی بارونق سڑکوں پر تنہائی کا تصور تک نہ کرتا تھا ــــــ لیکن یہاں ــــــ اس سحر زدہ وادی میں نہ تو وہ تنہائی سے ڈر رہا تھا اور نہ موت کی طرح بھیانک سناٹے سے ــــــ۔

"حسن اصغر کہاں ہو گا" ــــــ سگریٹ سلگاتے سلگاتے اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور ایک مرتبہ پھر بلندی سے پستی کی گہرائیوں کی طرف نظر دوڑائی، اچانک اس نے دیکھا کہ ایک پہاڑی پشتہ پر جو چاندنی میں چمک رہا تھا کوئی چیز رینگ رہی ہے ــــــ اور پھر ایک لمحہ بعد ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی ــــــ یقیناً یہ کوئی بے ضرر جنگلی جانور تھا ــــــ سلیم نے یہ سوچ کر اپنی الجھنوں کو تسکین دی ــــــ اور پھر ادھر ادھر دیکھنے لگا ــــــ۔

وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ حسن اصغر کو تلاش کر کے رہیگا، چنانچہ نئے فیصلہ اور ارادے کے تحت اس نے اپنے دوست کی تلاش کے لیے ایک دوسرا راستہ اختیار کیا ــــــ یہ راستہ سابقہ راستے کے مقابلہ میں بالکل مختلف تھا، اس میں جگہ بہ جگہ گہرے غاروں کا امکان تھا ــــــ کہیں زبردست ڈھلوان تھی اور کہیں ناقابل تسخیر چڑھائی ــــــ

لیکن سلیم چلتا ہی رہا ۔۔۔ اور ایک ایسے پشتہ پر سے جو اُدھر سے کافی کشادہ تھا چل کر ایک ناہموار غار نما وادی میں آگیا ۔۔۔ جس میں جا بجا پتھر کی جھونپڑیوں کے ویران آثار موجود تھے ۔۔۔

یہاں بھی بالکل سناٹا تھا ۔۔۔

اب سلیم کو خیال ہوا کہ اگر حسن اصغر نہ ملا اور وہ واپسی کے لیے راستہ بھول گیا تو اسکا کیا انجام ہوگا ۔۔۔ وہ یہ بھول بھی تو گیا تھا کہ وہ کس راستے سے یہاں آیا تھا ۔۔۔ چنانچہ اس نے چاہا کہ واپس جاکر مقبرہ کے نزدیک والی بلند چٹان پر کھڑے ہو کر حسن اصغر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تلاش کرے ۔۔۔ لیکن ابھی اس نے واپسی کے لیے اپنا پہلا قدم اٹھایا ہی تھا کہ اس نے ایک ایسی جھلک دیکھی کہ اس کے تنفس میں تیزی پیدا ہو گئی ۔۔۔

سلیم کی ڈری ڈری نظروں نے دیکھا کہ وادی کے بالکل وسط میں ایک انسانی سایہ حرکت کر رہا ہے ۔۔۔ ایک ایسا انسانی سایہ جو اس تنہا اور بھیانک مقام پر یقیناً اپنا خوفناک عکس ڈال رہا تھا ۔۔۔ سایہ کے ساتھ ایک روشنی بھی بار بار نیچے اوپر حرکت کر رہی تھی ۔۔۔ ایک لمحہ کے لیے اس کو اس سایہ پر حسن اصغر کا شبہ ہوا لیکن سایہ کی غیر معمولی جسامت دیکھ کر اسکا یہ شبہ کافور ہو گیا ۔۔۔ یقیناً یہ کوئی غیر بشری قوت کا عکس ہے ۔۔۔ سلیم نے سوچا اور جیسے اسکا قدم اس چٹان پر جم کے رہ گئے ۔۔۔ اس نے چاہا کہ وہ واپس بھاگ جائے لیکن خود اعتمادی

ختم ہو چکی تھی اور تمام شعوری احساسات پر ایک انجانا خوف مسلط ہو چکا تھا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے یہ سایہ غائب ہو گیا۔۔۔

اور پھر اس کے عقب میں بہت دُور ایک آواز سی آئی، جیسے زلیخا کے مقبرہ کے بالکل قریب کسی وجود کے چلنے سے کوئی آواز پیدا ہو رہی ہو۔ سلیم نے اپنی سہمی ہوئی نظریں مقبرہ پر جما دیں ۔۔۔ سلیم کی نگاہوں کے سامنے پتھر اور ریت کا ایک بہت بڑا انبار تھا۔ دائیں طرف چاند کی سبک کرنیں پھیلی ہوئی تھیں اور بائیں جانب آبنوس اور کھجور کے درختوں کا سایہ پڑ رہا تھا۔۔۔ اور بڑھتے ہوئے قدموں کی آواز قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ سلیم کے دماغ میں بہت سے خیالات پیدا ہوئے اور جیسے اسے جھریری سی آگئی، ڈر اور خوف کے تحت اسکے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔۔۔ اسکا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔۔۔۔ قدموں کی آواز قریب آگئی۔۔۔ بس تین چار منٹ کے بعد یہ سایہ چاند کی روشنی میں ہو گا۔۔۔

اور جب چاند کی روپہلی روشنی میں اس سایہ نے اپنا پہلا قدم رکھا تو سلیم کے منہ سے خوشی اور مسرت کی ایک آہ سی نکل گئی۔۔۔

چاندنی میں نہایا ہوا یہ سایہ حسن اصغر کا تھا۔۔۔

سلیم نے دیکھا کہ حسن اصغر ماحول سے بالکل بے پرواہ ہو کر زلیخا کے مقبرہ کی طرف جا رہا ہے۔ چٹان سے آہستہ آہستہ اتر کر سلیم بھی وہاں پہونچا اور اپنے دوست سے تقریباً ۲ گز کے فاصلہ پر ایک پتھر کی

آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ حسن اصغر یہاں رات کی تنہائی میں کیا کرنے آیا ہے۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے چاند کی مدھم روشنی میں حسن اصغر نے زلیخا کے مقبرہ کی طرف منہ کر کے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیے اور کہا۔

"اے اخناتون کی آخری وارث۔ اے احمس کی محبوبہ۔ اے ہزاروں سال سے سونے والی مصری شہزادی۔ دیکھ کہ آج تیرے دروازہ پر وہ آیا ہے جو آخری وقت تک تیرا سچا ہمدرد تھا۔"

اب حسن اصغر کی آواز بلند ہو گئی۔ اس نے تیز آواز میں کہا۔ "شہزادی زلیخا۔ تیرا آخری دوست گیتاری تیرے دروازہ پر کھڑا تجھے پکار رہا ہے۔ مجھے پہچان۔ میں گیتاری ہوں۔ تیرا رفیق اور تیرے محبوب کا دوست۔ رب حقیقی کی قسم۔ تو ہزاروں سال سے سو رہی ہے اور میں ہزاروں سال سے جاگ رہا ہوں۔ اس لیے میری برسوں کی ریاضت کو خاک میں نہ ملا۔ باہر آ۔ مجھے تجھ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔

زلیخا۔ تو خوب جانتی ہے کہ ماضی میں۔ گیتاری نے خواہ اسکا کوئی بھی نام رہا ہو تجھے کبھی نہیں پکارا۔ تو بھی اپنے نجات دہندہ کا انتظار کرتی رہی اور میں بھی۔ لیکن آج مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے۔ خدا کی قسم میری عقل حیران ہے کہ تیرے مقبرہ کے جن اندرونی راستوں سے میں سینکڑوں مرتبہ گزر چکا ہوں۔ وہ میرے لیے نئے

کیسے بن گئے ہیں۔ وہ راستے جو ہمیشہ میرے لیے کھلے رہے آج بند کیسے ہو گئے ہیں۔

اس لیے زلیخا — باہر آ — اور مجھے بتا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، دیوار کے نہ ٹوٹنے کا سبب کیا ہے — گداؤں کی ناکامی کا راز کیا ہے —؟

زلیخا — تجھے آسمان پر چمکنے والی محبت کی دیوی عشتار[عه۱] کی قسم تجھے رب السموات آنو کی قسم ہے۔ تجھے دیوتا انلیل[عه۲] کی قسم — تجھے طاقت کے دیوتا آیا کی قسم ہے — تجھے "شرگم" کا واسطہ — باہر آ — اس لیے کہ مسلسل ناکامی میرا دل توڑے دے رہی ہے۔

زلیخا — تاریخ کے صفحات میں لکھا ہو یا نہ لکھا ہو — لیکن میں جانتا ہوں کہ یا تو خدائے آفتاب کی بیٹی عشتار نے "اوزیرس" سے محبت کی اور یا پھر تو نے احمس سے — میں تیری دوشیزگی اور اس کی پاکیزگی کی قسم کھا سکتا ہوں — اس لیے اپنے اس پرانے رفیق کی مدد کر اور مجھے بتا کہ میں تیرے تابوت تک پہنچنے میں کیوں ناکام ہو رہا ہوں —

زلیخا — تجھے دیوی آئسس[عه۳] کا واسطہ — باہر آ — اس لیے کہ

عه۱ - عشتار — زہرہ کا مصری نام ہے، جس کو مادرِ عظیم کہا جاتا ہے۔

عه۲ - انلیل — مصریوں کا رب الارض و تقدار تھا۔

عه۳ - آئسس — مصریوں کی سب سے مقدس دیوی تھی۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ

(صفحہ ۱۴۴ پر دیکھیے)

میں تجھے پکار رہا ہوں ــــ میں گیتاری ــــ احمس کا دوست ــــ"

اور پھر سلیم نے دیکھا کہ مقبرہ کی باہری دیوار پر ایک سفید دھبہ ابھرا اور اس دھبہ نے دھیرے دھیرے ایک انسانی شکل اختیار کر لی، ـــ۔ اب زلیخا حسن اصغر کے بالکل سامنے کھڑی تھی! وہی نیلی آنکھیں ــ ویسا ہی سفید لباس ــ مرمریں گلے میں سونے کا ویسا ہی سانپ ــ

"میں آگئی گیتاری ــــ میں آگئی ــــ"

"میں جانتا تھا کہ تم ضرور آؤگی ــــ جس طرح مجھے یہ یقین ہے کہ تم ابھی ہزاروں سال کی نیند سے بیدار ضرور ہوگی"

"گیتاری ــــ اے میرے مونس و ہمدرد مجھے معلوم ہے کہ آج تم کتنا پریشان ہو اور یہاں آنے سے قبل تم نے کس طرح اخناتون کے بنائے ہوئے ایک خدا کی پوجا والے مندر میں کس طرح اپنی کامیابی کی دعا

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳) عالم ارواح میں سایہ اوزیرس کے دوش بدوش صدارت کے فرائض انجام دیتی ہے۔ طوفان عظیم ـــ یعنی طوفان نوح کی مصری حکایت میں آہا تور کی حیثیت سے انسانوں کو تباہ کرتی ملتی ہے۔ قدیم مصری دیومالا میں اس کے متعلق ایک دلچسپ کہانی یہ بھی مشہور ہے کہ پہلے یہ زمین پر رہا کرتی تھی۔ ایک روز اسے آسمان پر جا کر بس جانے کی سوجھی اور یہ بوڑھے دیوتا "را" کا خفیہ نام معلوم کیے بغیر ممکن نہ تھا چنانچہ اس نے ایک سانپ بن کر را کو ڈسا۔ "را" بہت مضطرب ہوا تو اس نے زہر اتارنے کا وعدہ اس شرط پر کیا کہ وہ اپنا خفیہ نام بتلادے۔ مجبوراً را کو بتلانا پڑا اور اس طرح اس نے آسمان کو اپنا مسکن بنالیا۔

مانگی تھی۔ لیکن گیتاری ۔۔۔ میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی اس لیے کہ اسپاتا کی خبیث روح ہمارے راستہ میں حائل ہے' اس نے اپنی خباثت کے بل پر مقبرہ کی دیواروں کو ہلا دیا ہے ۔۔۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا کہ میں بیدار ہو کر احمس سے ملوں ۔۔۔"

"پھر میں کیا کروں شہزادی ۔۔۔"

"اسپاتا کا جسم برباد کردو ۔۔۔ اس کے بعد وہ حشر تک کے لیے ہمارے راستہ سے ہٹ جائیگا ۔۔۔ اور گیتاری تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اسکی ممیائی شدہ لاش کہاں رکھی ہوئی ہے۔"

"میں سمجھ گیا زلیخا ۔۔۔ اے کاش یہ راز مجھے پہلے ہی دن معلوم ہو جاتا تو اتنی بھی تاخیر کیوں ہوتی ۔۔۔"

"پھر میں جا رہی ہوں گیتاری ۔۔۔ اخناتون کی قسم میں تھک چکی ہوں ہزاروں برس کی نیند نے میرا جسم توڑ کے رکھ دیا ہے ۔۔۔"

"اور پھر سلیم کے دیکھتے ہی دیکھتے اسکی محبوبہ کی پرچھائیں غائب ہو گئی۔ حسن صغر چند منٹ تک محویت کے عالم میں کھڑا رہا اور اس کے بعد تیز تیز قدموں کے ساتھ ایک انجانی سمت کی طرف روانہ ہو گیا ۔۔۔

سلیم بھی اسکا تعاقب کرتا رہا۔

متعدد پیچ در پیچ راستوں اور کھنڈروں سے گزرنے کے بعد حسن صغر ایک بوسیدہ عمارت کے کھنڈروں کے پاس جا کر رک گیا ۔۔۔ سلیم نے دیکھا کہ کھنڈر کے مسمار شدہ پھاٹک کے ملبہ پر ایک اور سایہ موجود تھا ۔

اچانک فضا میں ایک نیم انسانی آواز بلند ہوئی ـــ

"گیتاری ـــ وہیں رک جاؤ ـــ یہیں ہو اسپاتا"

"لیکن کیوں رک جاؤں ـــ" گیتاری کی آواز میں بالکل نیا عزم تھا

"اس لیے کہ میں اپنے جسم کی بربادی نہیں چاہتا ـــ مجھے اچھی طرح اچھی طرح معلوم ہے کہ شہزادی نے تمھیں میرا یہ راز بتا دیا ہے کہ میں اس کے مقبرہ کے چاروں طرف ایک آہنی حصار کھینچ چکا ہوں اور وہ اسی صورت میں ٹوٹ سکتا ہے جب میرا جسم برباد کر دیا جائے ـــ"

"ہاں ـــ اور تم جانتے ہو کہ تمھارا جسم برباد کرنے کی قوت مجھ میں موجود ہے ـــ" گیتاری نے زیر لب تبسم کے ساتھ کہا۔

"معلوم ہے ـــ لیکن گیتاری ـــ کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم دونوں صلح کر لیں ـــ"

"میں کمزور غبیث اور شیطان روحوں سے صلح کا قائل نہیں ـــ"

"لیکن گیتاری ـــ ذرا سوچ ـــ زلیخا میری قانونی منگیتر ہے، سیٹھی ادل نے فرعون زماں کی حیثیت سے میری اور اسکی منگنی کر دی تھی، قانونا اور اخلاقاً وہ میری ہو گئی تھی اور آج بھی ہے ـــ پھر میں اسے کیسے کسی دوسرے کے حوالے کر دوں"

"میں بحث میں اپنا وقت برباد کرنا نہیں چاہتا اسپاتا ـــ زلیخا کی بیداری میری زندگی کا مقصد ہے اور میں اس مقصد کو حاصل کر کے ہم لوں گا ـــ"

"یعنی میرا جسم ضرور برباد کر دو گے ۔۔۔" اب اسپاتا کے لہجے میں لجاحت تھی ۔

"ہاں ۔۔۔ یہ میرا فیصلہ ہے ۔۔۔ کیونکہ مجھے یہ راز معلوم ہو چکا ہے۔"

"نہیں گیتاری ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ تمھیں دیوتا کی قسم ۔۔۔" اسپاتا کی روح بھیک مانگنے کے انداز میں چیخ اٹھی ،

"دیوتا کی قسم بیکار ہے اسپاتا ۔۔۔ تمھارا دیوتا جہالت کی تاریکیوں میں گم ہو چکا ہے اور دنیا جان چکی ہے کہ ماضی میں جو تمھارا دیوتا تھا وہ صرف سورج ہے آسمان کا ایک طاقتور ستارہ ۔۔۔ بس چند منٹ کی مہلت اور ہے اس کے بعد میں تمھاری ممی کے نزدیک پہنچ جاؤں گا اور ۔۔۔ پھر ۔۔۔"

"نہیں ۔۔۔ تم ایسا نہیں کر سکتے ۔۔۔ میں اس کے لیے تیار ہوں کہ تمھیں اپنا منصف بنا کر انصاف کر لوں ۔۔۔"

"لیکن میں تمھارا منصف بننے کے لیے تیار نہیں ہوں ۔۔۔"

"نہ ہو ۔۔۔ لیکن ذرا اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہو کہ قانوناً اور اخلاقاً ذلیخا میری ہے یا نہیں ۔۔۔"

"محبت اور محبت کے جذبات قانون اور اخلاق کی ترازو میں نہیں تولے جاتے اسپاتا ، اس کے سودے کا تعلق دل سے ہے اور دل جس کا ایک مرتبہ ہو جاتا ہے پھر دوسرے کا نہیں ہوتا ۔۔۔ میں تم سے پوچھتا ہوں کہ کیا تمھاری منگنی سے قبل ذلیخا ۔۔۔ اس کی نہیں تھی ؟"

خیر ــــ تم رفاقت اور دوستی کے جذبہ میں ڈوب کر اخلاق اور قانون تک کی قدروں تک کو بھولے جا رہے ہو گیتادی ــــ لیکن یاد رکھو اس دنیا کا نظام اسی وقت تک چلے گا جب تک لوگ قانون اور اخلاق کی حدود کا احترام کریں گے ــ آج تمہیں محض اس لیے کہ تم میری روح سے زیادہ طاقتور ہو اسکا پورا حق حاصل ہے کہ تم میرے جسم کو برباد کرنیکی دھمکی دے کر مجھ سے میری شمشیر چھین لو ــ لیکن میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ تم ایسا ضرور کرو ــ میرا نام بھی اسپاتا ہے گیتادی ــ جاؤ اپنا جسم بچانے کی خاطر میں اپنا سحر ختم کر رہا ہوں ــ زلیخا کے مقبرہ کے چاروں طرف میں نے جو آہنی حصار کھینچ دیا تھا وہ کل صبح تک موم کی طرح پگھل جائیگا ــ اور تم مقبرہ کا دروازہ توڑنے میں کامیاب ہو جاؤ گے ــ میں جانتا ہوں کہ تم شہزادی زلیخا کو بیدار بھی کر لو گے ــ لیکن اس کے بعد مجھے دیکھنا ہے کہ تم زلیخا کو اخمس کے حوالے کیسے کرو گے ــ؟ اور یہ کہہ کر اسپاتا کی روح نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا ــ دیر تک اس لرزا دینے والے قہقہے کی صدائے بازگشت فضا میں گونجتی رہی ــ حسن اصغر دم بخود کھڑا رہا اور اس کے بعد وہ ٹھیک اسی جگہ آگیا جہاں سلیم پتھر کی آڑ میں کھڑا ہوا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا ــ۔

سلیم اور حسن اصغر کی نظریں چار ہوئیں ــ ایک مشفقانہ مسکراہٹ حسن اصغر کے لبوں پر پھیلی اور اس نے سلیم کے کاندھے پر اپنا ہاتھ رکھ کر

کہا۔ "کہانی ختم ہونے والی ہے سلیم اس لیے میں نے خود چاہا تھا کہ تم میری اور اسپاتا کی تمام گفتگو اپنے کانوں سے سن لو۔ میں اب کوئی بات راز رکھنا نہیں چاہتا۔ میں راتھم گیتاری ہوں۔ تمھاری مصری زندگی کا آخری رفیق۔ مجھ میں اور تمھارے وجود میں فرق صرف اتنا ہے کہ تم نہیں جانتے تھے کہ تم خان بہادر عازم الدین کے بیٹے کے علاوہ احسن بھی ہو اور میں اپنی پیدائش کے وقت بھی جانتا تھا کہ میں گیتاری ہوں۔ اس لیے کہ میں زلیخا کی بے مثال قربانی سے متاثر ہو کر عین اس وقت جبکہ وہ زندہ ممی بنا کر اپنے تابوت میں لٹائی جا رہی تھی قسم کھائی تھی کہ میں نہ صرف زلیخا کو پیدا کر کے رہوں گا بلکہ اس کو اس کے محبوب سے بھی ملاؤں گا۔

۳ ۱/۲ ہزار سال گذر گئے میری اس قسم کو۔ میں پیدا ہوتا رہا اور مرتا رہا۔ اور سلیم۔ تمھیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ سینکڑوں دفعہ پیدا ہونے اور مرنے کے بعد بھی میری شکل وصورت، خدوخال اور قد و قامت میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ اور میں آج بھی بالکل وہی ہوں جو آج سے ۳ ۱/۲ ہزار سال قبل فرعون سیسٹی کے دور حکومت میں تھا۔ میں جانتا ہوں تمھیں میری بات سن کر حیرت ہو رہی ہوگی لیکن سلیم یہ عالم ارواح، قوت ارادی اور علوم باطنی کا ایک ادنیٰ سا کرشمہ ہے جس کی نظر میں نہ زندگی ہے نہ موت، نہ ماضی ہے نہ مستقبل۔ نہ زمین ہے نہ آسمان۔ اور نہ جس پر گذرتے ہوئے وقت کا کوئی اثر پڑتا ہے۔

تم یوں سمجھ لو کہ دنیا کے نزدیک سیٹی اول کے دورِ حکومت کو ۳½ ہزار سال گزر چکے ہیں لیکن چشم باطنی کے نزدیک یہ طویل مدت ایک لمحہ سے بھی کم ہے۔ بہرحال یہ ایک الجھا ہوا فلسفہ ہے جو میں یہاں چند منٹ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا لیکن اس فلسفہ کا زندہ ثبوت میں تمہیں دکھا ضرور رہا ہوں۔ اور یہ ثبوت خود میرا وجود ہے ۔ جو تمہاری نگاہ میں حسن اصغر تھا۔ لیکن ہے وہ گیتاری۔

سلیم ۔ تمہیں یاد ہوگا کہ جب تم نے تغلق آباد کے کھنڈروں کی ایک بُرجی پر سب سے پہلے زلیخا کی ایک ہلکی سی جھلک دیکھی تھی تو راستہ میں تم کو ایک ایسا انسان بھی ملا تھا جو مصری لباس میں ملبوس تھا۔ تم جانتے ہو وہ انسان کون تھا ۔ وہ میں تھا سلیم۔ آج کا حسن اصغر اور گزرے ہوئے ماضی کا گیتاری۔ جس کے نزدیک نہ وقت کی کوئی مدّت ہے اور نہ نام کے کوئی معنی۔ وقت کم ہے سلیم ورنہ میں تمہیں تفصیل سے بتاتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ۔ قاہرہ کی سڑکوں پر پھرنے والا حسن اصغر تغلق آباد کے کھنڈروں میں کیسے پہونچا اور زلیخا نے تمہیں اپنی جھلک دکھا کر تمہیں اپنی طرف راغب کیسے کیا ۔ ؟

سلیم ۔ میرے دوست ۔ وہ وقت بہرحال آگیا جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا۔ تم اطمینان رکھو۔ کل دوپہر تک زلیخا کے مقبرہ کا ہر دروازہ کھل جائیگا ، ہم دونوں اسکے تابوت کے

پاس ضرور موجود ہوں گے۔ اور پھر آج کا مورخ اپنی آنکھ سے دیکھ لیگا کہ اگر ایک طرف محبت کی ماری ہوئی عورت کا جسم حکمت کے اصولوں پر ہزاروں سال تک زندہ رہا تو دوسری جانب ایک انسان کی روح بھی محض اپنی قوت ارادی کے بل پر علم الارواح کے سہارے ہزاروں سال تک ایک ہی جسم کو اپنا مسکن بنائے رہی۔

تم اسپاتا کی خباثت سے بھی مطمئن رہو۔ وہ مجھے چیلنج دے کر گیا ہے کہ زلیخا بیدار ہی کے بعد بھی اخمس یعنی سلیم کی نہیں ہو سکتی لیکن وہ یہ بھول گیا ہے کہ اس کے مقاصد برے اور میرے مقاصد نیک ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ نیکی اور بدی کی اس لڑائی میں فتح بہر حال نیکی کی ہی ہوگی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں اسپاتا کو فنا نہیں کر سکتا لیکن میں اسپاتا کو اس قابل بھی نہیں رکھونگا کہ وہ تمھیں یا شہزادی کو کوئی نقصان پہونچا سکے۔"

حسن اصغر ابھی کچھ اور کہتا کہ اسے دور سے روشنی نظر آئی۔ چنانچہ اس نے اپنی گفتگو نامکمل ہی ختم کر دی اور حیران و مبہوت سلیم سے کہا۔"وہ دیکھو تمھارے والد اپنے دوستوں کے ساتھ تمھیں تلاش کرتے ہوئے یہاں تک چلے آئے۔ اس لیے آؤ۔ چلیں۔ ورنہ وہ زیادہ پریشان ہو جائینگے۔ چلتے چلتے میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں کہ تم آج رات کی کوئی بات کسی سے نہ کہنا۔"

باب ــــــ ۱۳

واپسی پر دونوں کی ملاقات عازم الدین اور ان کے ساتھیوں سے ہو گئی۔۔۔ عازم الدین کافی گھبرائے ہوئے تھے۔۔۔۔ طرانی کے پوچھنے پر سلیم نے بتایا کہ وہ اور حسن اصغر دونوں مل کر زلیخا کے مقبرہ کی پُرسکون جانچ پڑتال کر رہے تھے۔

سلیم کے اس جواب نے طرانی کے علاوہ سب کو مطمئن کر دیا۔ جواب سن کر طرانی نے حسن اصغر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا ایک انجانی مسکراہٹ اس کے لبوں پر پھیلی اور وہ گردن جھکا کر ایک طرف چل دیا۔

اگر اس مسکراہٹ کی کوئی زبان ہوتی تو یقیناً ہر شخص سن لیتا کہ طرانی کی مسکراہٹ نے چیخ چیخ کر کہا تھا۔۔۔ "کوئی جانے یا نہ جانے حسن اصغر۔۔۔ لیکن میں خوب سمجھ رہا ہوں کہ تم کہاں گئے تھے۔۔۔ اور سلیم تمہارے ساتھ

کیوں تھا ۔۔۔ اس لیے کہ میں نے اپنے بال دھوپ میں نہیں ۔۔۔ مصر کے ان ہی کھنڈرات اور اس کے ماضی کے اسرار کی عقدہ کشائیوں میں سفید کیے ہیں ۔۔۔"

یہ رات بھی سلیم کو جاگتے ہی گزری ۔۔۔ تمام رات وہ زلیخا کے تصور میں ڈوبا رہا اور ایسا محسوس کرتا رہا جیسے اس کے دماغ کے تاریک گوشے بتدریج روشن ہو رہے ہیں ۔۔۔ وہ کچھ بھول رہا ہے ۔۔۔ اسے کچھ یاد آرہا ہے ۔۔۔ ماضی کے پردے چاک ہو رہے ہیں ۔ تاریکی میں روشنی ابھر رہی ہے ۔۔۔ کوئی چیز اس کے ذہن کی موٹی دیواروں میں شگاف ڈال رہی ہے ۔۔۔ جیسے کوئی شے اس کی آنکھوں کے سامنے آرہی ہے اور جا رہی ہے ۔۔۔ کبھی اندھیرا ہو رہا ہے ، کبھی اجالا ہو رہا ہے ۔۔۔ سورج نکل رہا ہے ۔۔۔ سورج غروب ہو رہا ہے ۔۔۔ چاند بڑھ رہا ہے ۔۔۔ چاند گھٹ رہا ہے ۔۔۔ بہار آرہی ہے ۔۔۔ بہار جا رہی ہے ۔۔۔ اور پھر جیسے بالکل اچانک اسے سب کچھ یاد آگیا ۔۔۔

وہ چیخ پڑا ۔۔۔ "ہاں ۔۔۔ میں ، احمس ہوں ، ۔۔۔ میں بالائی مصر کی خانہ جنگی میں مارا گیا تھا ۔۔۔ زلیخا میری محبوبہ تھی ، گیتاری میرا دوست تھا ، "حطشی" میری ماں تھی "جوتوتی" میرا باپ تھا ۔۔۔ اور یہ میں تھا جس نے مصر کو "ہائیکوس" کی بغاوتوں سے نجات دلائی تھی ۔"

ماضی کے گہرے نقوش یاد آتے ہی سلیم کے چہرے پر سکون و اطمینان کی لہریں پھیل گئیں ۔۔۔ اب اسے کوئی الجھن نہ تھی ۔۔۔ اسکی سوئی ہوئی

قوتِ بیدار ہوچکی تھی، اسے یاد آچکا تھا کہ اسکا شمار مصر کے بہادر ترین آدمیوں میں سے ایک تھا، اور اسکا خاندان ملک کا ایک خوشحال اور مہذب خاندان سمجھا جاتا تھا۔

دھیرے دھیرے سلیم کو یاد آیا کہ زلیخا اور وہ ۔ ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے تھے ۔ بچپن کی گہری اور خلوصانہ محبت جو بعد میں ایک جوان محبت میں تبدیل ہوگئی تھی ۔ اور پھر سلیم کو اپنی محبت کا ایک رنگین واقعہ یاد آگیا۔

شام گہری اور تاریک تھی، افق پر کالے بادل چھا رہے تھے، ساری کائنات پر ایک رومان انگیز سناٹا طاری تھا اور زلیخا حوروں جیسے سفید لباس میں اس کے ساتھ شہر کے باہر ایک باغ میں ٹہل رہی تھی، اچانک بادل گرجے اور تیز بارش شروع ہوگئی ۔ دونوں نے دوڑ کر ایک درخت کے نیچے پناہ لی ۔ اس طرح کا دونوں کا جسم ایک دوسرے سے ملا ہوا تھا ۔ بارش کا سلسلہ جاری تھا جس کی وجہ سے زلیخا نے کہا "احمس ۔ مجھے گھر پہنچا دو ۔ میری والدہ بہت پریشان ہو رہی ہونگی کیونکہ آج تک ایسا نہیں ہوا کہ میں اتنی رات تک گھر سے باہر رہی ہوں" اور یہ کہہ کر جب اس نے احمس کی طرف دیکھا تو اسکی آنکھوں سے دوشیزگی کا معصوم خوف جھلک رہا تھا، ایک ایسا خوف جس میں محبت کے پاکیزہ اور معطر جذبات بھی ملے ہوئے تھے ۔ اور جواب میں احمس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اس کے

بھیگے ہوئے چہرے کو تھام کر کہا ۔۔۔ "زلیخا ۔۔۔ تم میری زندگی ہو ۔۔۔ اور جب تم میری ہو تو مجھے دنیا کی کسی قوت سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ۔ شمالی جنگ سے واپس ہوتے ہی میں تم سے شادی کرونگا ۔۔۔"

"اور تم کب واپس آؤ گے ۔۔۔"

"جب یہ جنگ فتح کی صورت میں ختم ہو گی ۔۔۔"

"اور اگر نہ ختم ہوئی تو ۔۔۔" بادل اور زور سے گرجے ۔

"تو تمہیں میرا انتظار کرنا پڑیگا ۔۔۔" احمس نے زلیخا کا سر اپنے دھڑکتے ہوئے سینہ پر رکھکر کہا ۔

اسی طرح رات بہت زیادہ بیت گئی ،

اور جب بارش کے پانی سے شرابور دونوں گھر کی طرف روانہ ہوئے تو گویا بارش کی پہلی بوند کی طرح دونوں پاکیزہ اور کنوارے تھے لیکن دونوں کی روحیں ایک دوسرے میں ضم ہو چکی تھیں ۔۔۔ ایک عجیب سا احساس دونوں کی روح کی گہرائیوں میں اپنا نقش چھوڑ گیا تھا ۔ کسی انجانے تصور سے زلیخا کے رخسار دہکتے ہوئے انگارے بن گئے تھے اور اسکی نیلی آنکھوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک شوخ لیکن شرمیلی مسکراہٹ نے جنم لے لیا تھا ۔۔۔

ایک ٹھنڈی سانس لیکر جب سلیم نے خیمہ کی کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھا تو صبح کی روشنی پھیل رہی تھی ، آس پاس کے خیموں میں زندگی انگڑائی لے رہی تھی ، کھدائی کرنے والے مزدوروں کی بات چیت کی آوازیں فضا

میں پھیل رہی تھیں، آج سلیم اداس نہ تھا، مضمحل نہ تھا، بے چین نہ تھا۔ اسے پورا یقین تھا کہ آج دوپہر تک زلیخا کا مقبرہ کھول لیا جائیگا۔

ایک طویل اور فاتحانہ انگڑائی لیکر سلیم بھی خیمے کے باہر آگیا۔ سامنے کچھ فاصلہ پر زلیخا کے مقبرہ کے بالائی حصہ پر سورج کی پہلی کرن کا رقص ہو رہا تھا،

ایک گھنٹہ کے اندر ہی تمام افراد مقبرہ پہونچ گئے،

کھدائی شروع ہو گئی۔ طہرانی اور حسن اصغر کی ٹولیاں الگ الگ کام کر رہی تھیں، حسن اصغر زیادہ جوش اور انہماک سے کام کر رہا تھا۔ سنگین دیوار کے بڑے پتھر پر مسلسل چوٹ پڑ رہی تھی۔

اچانک ایک مزدور چیخا۔" پتھر میں دراڑ پڑ گئی صاحب" اب سب مل کر اس دراڑ کو ایک چوڑی شگاف بنا دو۔ کدالوں کے بجائے چھینیو اور ہتھوڑوں سے کام لو۔ ایک لمحہ برباد نہ کرو" حسن اصغر نے چیخ کر تمام مزدوروں کو ہدایت کی۔ پلک جھپکتے میں طہرانی والی پارٹی کو بھی اس دراڑ کی اطلاع پہونچ گئی، سب یہاں جمع ہو گئے۔ اور کام میں شدت آگئی،

دوپہر تک پتھر میں اتنا بڑا شگاف بنا لیا گیا کہ ایک آدمی اس میں داخل ہو سکتا تھا۔ حسن اصغر نے کہا" سب سے پہلے میں اس میں داخل ہونگا،" حسن اصغر نہ کہتا تب بھی پارٹی کے کسی فرد میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اس شگاف میں داخل ہوتا۔

اللہ کا نام لیکر ایک نئے عزم آہنی ارادے اور فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ حسن اصغر اس شگاف میں داخل ہو گیا۔

یہ لمحات ہر ایک کے لیے انتہائی صبر آزما تھے "اندر زہریلی گیس بھی تو ہو سکتی ہے" ڈاکٹر بیگ نے دل ہی دل میں کہا۔ اور اپنی نگاہیں شگاف پر مرکوز کر دیں۔

اور سلیم یہ سوچ رہا تھا "اسپاتا نے آخر کار اپنا سحر واپس ہی لے لیا ورنہ ناممکن ہے کہ یہ پتھر ٹوٹتا"

چند منٹ کے بعد پسینہ میں شرابور حسن اصغر واپس آیا۔ سوالیہ اور بیتاب نظروں سے ہر شخص نے اسکی طرف دیکھا۔ "بیس فٹ تک راستہ صاف ہے لیکن اس کے بعد ملبہ نے راستہ مسدود کر دیا ہے۔ ہوا بالکل صاف ہے، اس لیے مزدور اس میں داخل ہو کر ملبہ ہٹا سکتے ہیں۔" حسن اصغر نے سب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تم نے اور کیا دیکھا" طرانی نے بےچینی سے پوچھا۔

"ملبہ ہٹ جائے تو ایک لمبا راستہ ملے گا۔ اور اگر کوئی اور دروازہ نہ ہوا تو چند گزوں سے گزرنے کے بعد ہم خود کو شہزادی زلیخا کی آرام گاہ میں پائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اگر ملبہ صاف کر لیا جائے تو شام سے قبل ہی ہمیں ہمارا مقصد حاصل ہو جائیگا۔"

اور جیسے حسن اصغر کے اس جملے نے پارٹی کے تمام افراد کے پژمردہ چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

تین بجتے بجتے مزدوروں نے ملبہ ہٹا دیا۔۔۔ سُرنگ سے جھانکنے پر پتہ چلا کہ اب راستہ بالکل صاف ہے۔۔۔ سب سے پہلے حسن اصغر اور اس کے بعد دیگر تمام افراد ہاتھ میں لالٹینیں لیکر سُرنگ میں داخل ہو گئے۔

اندر مستطیل محرابیں تھیں اور کھلے ہوئے دروازے تھے۔۔۔ ہر شخص کا دل آنے والے خطرات کے تصوّر سے دھڑک رہا تھا لیکن حسن اصغر بالکل پرسکون تھا۔۔۔ جلد ہی وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں پہونچ گئے۔۔۔ جو بالکل سادہ اور نقش و نگار سے بالکل خالی تھا۔۔۔ داہنی جانب ایک دروازہ تھا اور ہمیں داخل ہونے کے بعد ایک سُرنگ نما راستہ۔ سُرنگ میں بے انتہا گرمی تھی، دم گھٹتا جا رہا تھا لیکن اس کے باوجود سب اس میں داخل ہو گئے۔۔۔ راستہ ڈھلوان تھا۔۔۔ حسن اصغر نے کہا۔۔۔ "غالباً ہمیں یہ سرنگ کسی تہ خانے میں لیجائیگی۔۔۔" اور واقعی تقریباً پچاس قدم چلنے کے بعد وہ ایک چوکور کمرے میں پہونچ گئے۔ جو چٹانوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا، کمرے کی اونچائی تقریباً نو فٹ تھی۔۔۔ کمرے میں کوئی سامان نہ تھا۔۔۔ حسن اصغر اور طہرانی نے روشنی کی مدد سے تمام دیواروں کو دیکھا۔۔۔ بائیں جانب کی دیوار میں ایک آہنی چرخی لگی ہوئی تھی۔۔۔ حسن اصغر نے یہ چرخی پوری قوت سے گھمائی۔۔۔ اور ایک ہلکی گرج آواز کے ساتھ دیوار کا ایک پتھر ہٹ گیا۔

اب ایک اور تاریک راستہ تھا۔۔۔

ایک ایک کرکے دھڑکتے ہوئے دلوں اور متجسس نگاہوں کے ساتھ

تمام افراد اس راستہ میں داخل ہوگئے۔ چند قدموں کے بعد یہ راستہ ایک محراب نما دروازہ پر ختم ہوا۔ اور جب سب اس دروازہ سے ایک ہال نما کمرے میں داخل ہوئے تو عاذم الدین کے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔

ہال کے وسط میں ایک بڑے گلابی پتھر کے چبوترے پر ایک تابوت رکھا ہوا تھا۔ ایک ایسا تابوت جس کو یقیناً انسانی ہاتھوں نے صدیوں سے نہیں چھوا تھا۔

کمرے کی دیواروں پر بجید صفائی سے روغن کیا ہوا تھا، خوبصورت نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ تابوت کے قریب ایک سنگی تپائی رکھی ہوئی تھی اور اس پر نقش تھا۔ "شہزادی زلیخا اس تابوت میں سو رہی ہے"۔ اور جب طرانی نے تابوت کے سرہانے روشنی ڈالی تو اس پر قدیم مصری زبان میں نقش تھا۔

"سونے والی جسے بیدار کیا جائیگا"

حسن اصغر اور سلیم کے علاوہ ہر ایک کے ماتھے پر پسینہ آگیا۔ وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ کامیابی اتنی جلد ان کے قدم چومیگی اور نئی دہلی کے ایک کمرے میں بیٹھکر محض ایک قدیم دستاویز کے سہارے انھوں نے جو خواب دیکھا تھا وہ ایک زندہ اور روشن حقیقت بن کر انکے سامنے آجائے گا۔

تابوت کا ڈھکن بند تھا۔ اور ہر شخص خاموش تھا۔ وہ اسی

تابوت کے اندر زلیخا سو رہی ہے ۔۔۔ ۳½ ہزار سال سے سو رہی ہے ، سیمیٹ اڈول کے ایک بھیانک تجربہ کے تحت مسلسل سو رہی ہے ، ۔۔۔ سو رہی ہے اور اپنے محبوب کا انتظار کر رہی ہے ۔۔۔

"لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ شہزادی مر چکی ہو ! اور تابوت کے اندر سے ہمیں اسکی لاش ملے ۔۔۔" ڈاکٹر بیگ نے دل ہی دل میں سوچا ۔۔۔

"آج کا کام ختم ہوا آقائے طہرانی ۔۔۔ اب کل دن میں شہزادی کا تابوت کھولا جائیگا ۔۔۔" حسن اصغر نے مضبوط آواز سے کہا ۔

اور کانپتے ہوئے قدموں کے ساتھ سب مقبرہ کے باہر نکل آئے ۔۔۔

باب ــــــ ۱۴

فتح کی یہ رات واقعی بہت حسین تھی،

پارٹی کے تمام افراد مسرور تھے ــــ ایک ناممکن بات ممکن ہو چکی تھی، ــــ طہرانی بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا ــــ پروفیسر اور ڈاکٹر بیگ بھی بے حد خوش تھے ــــ اور عازم الدین کی تو خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ تھا، لیکن شاید ابھی قدرت کو ان کی مکمل خوشی منظور نہ تھی،

خیمہ کا پردہ اٹھا ــــ اور حسن اصغر نے جو غالباً دُور سے دوڑا ہوا آ رہا تھا طہرانی کو تقریباً جھنجھوڑتے ہوئے کہا ــــ "ابھی ابھی مجھے خبر ملی ہے کہ ہوّارہ کے عربوں کی ایک بڑی جماعت قبیلہ حمّام کے شیخ کی سرکردگی میں الخارجہ سے روانہ ہوئی ہے اور ان کا رخ اسی وادی کی طرف ہے ــــ"

"لیکن ان کے آنے کا کیا مقصد ہو سکتا ہے ــــ" عازم الدین نے

گھبرا کر کہا۔

"ان کو خفیہ طور پر اطلاع ملی ہے کہ مالدار ہندوستانیوں کی ایک جماعت کسی مدفون خزانہ کی تلاش میں اسی وادی میں قیام پذیر ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ ہم سب کو لوٹنا چاہتے ہونگے" حسن اصغر نے کہا۔

"پھر کیا ہوگا ———؟" ڈاکٹر بیگ تقریباً بوکھلا گئے۔

"افسوس صرف اسکا ہے کہ خود ہم نے مصلحتاً اور ضرورتاً حکومت کو اپنی آمد کا مقصد غلط بتایا تھا ——— جس کی وجہ سے ہم پولیس کی کوئی مدد بھی نہیں لے سکتے اور اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے کہ ہم بذات خود ان حملہ آور عربوں کا مقابلہ کریں۔"

"لیکن یہ عرب بھی تو باقاعدہ مسلح ہونگے" طہرانی نے کہا۔

"ہاں لیکن ان کی بندوقیں توڑے دار پرانی ساخت کی ہیں، اور ہم جدید آتشین اسلحہ سے مسلح ہیں ——— اس لیے مقابلہ زیادہ دشوار نہ ہوگا" ——— حسن اصغر نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"تو ——— تیاری کی جائے، ہم ہر قیمت پر ان کا مقابلہ کریں گے ———" یہ سلیم کی آواز تھی،

"تم یہاں تیاری کرو اور میں مقبرہ کا بڑا شگاف بند کرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ حملہ آور عرب اسمیں داخل ہو جائیں اور شہزادی کے تابوت کو نقصان پہونچ جائے" حسن اصغر جملہ ختم کرتے ہی خیمہ سے باہر نکل گیا۔

اور طہرانی نے کہا۔ "حسن اصغر کے بڑے بڑے دماغی ٹھیک کہتے

تھے۔ تم واقعی مرد عاقل ہو، اور تم میں حقیقتاً کوئی نیک لیکن بجید پرانی روح حلول کر گئی ہے۔" طہرانی نے زیرِ لب کہا۔

مقابلہ کی تیاری ہونے لگی۔ تمام مزدور بھی بندوقوں سے مسلح کر دیئے گئے۔ جب سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو طہرانی نے عازم الدین سے کہا۔ شہزادی کے مقبرہ کی سلامتی کی طرف سے ہمیں بالکل بے فکر رہنا چاہیے اس لیے کہ عربوں کا عقیدہ ہے کہ اس وادی میں غیر انسانی قوتوں کا اثر ہے اور یہاں خبیث روحیں رہتی ہیں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ وادیٔ اسلاف فرعون کی طرف رخ بھی نہ کریں گے اور ان کی یلغار ہماری ہی سمت ہو گی۔"

"لیکن آقائے طہرانی۔ ہماری تعداد بالکل کم ہے۔ اور یہاں سے قریب ترین بستی بھی کم از کم دس میل کے فاصلہ پر ہے ورنہ ہم فوری طور پر وہاں کے آدمیوں سے مدد حاصل کر سکتے تھے۔" عازم الدین نے پژمردگی سے کہا۔

"تعداد کی کمی سے ہراساں نہ ہوئیے ڈیڈی۔ آپ دیکھیے گا کہ میں کتنی شاندار جنگ لڑتا ہوں۔" سلیم نے بے پروائی سے کہا۔

"لیکن میرے بیٹے۔ تم نے تو کبھی بندوق بھی نہیں اٹھائی ہے۔"

عازم الدین کو جواب دینے کے بجائے سلیم صرف مسکرا دیا۔ بھلا وہ اپنے بوڑھے راسخ العقیدہ باپ کو یہ بات کیسے بتاتا کہ نئی دہلی کے سلیم اور یہاں کے سلیم میں زمین آسمان کا فرق پیدا ہو چکا ہے۔ طوفانِ حوادث نے ۳۵ ہزار سال پرانے دور کو آج کے دور میں ضم کر کے ایک مرتبہ پھر احمس کو زندہ کر دیا ہے۔ وہ احمس جو اپنے دور کا بہادر ترین نوجوان

تھا اور جس کی ساری عمر جنگ اور صرف جنگ میں گذری تھی۔

اب ہر شخص اپنے مورچہ پر تھا۔

دور بہت دور وادی کے شمالی اطراف میں شاہراہ عظیم پر روشنی کی ایک کرن روپہلی تار کی طرح قطار در قطار کھنچی ہوئی تھی۔ حملہ آور عرب ہر لمحہ نزدیک پہونچتے جارہے تھے۔ ایک جنگجو اور تجربہ کار سپہ سالار کی طرح سلیم نے خیمہ کے چاروں طرف اور اطراف کے بلند ٹیلوں پر اپنے آدمی تعینات کردیئے تھے۔ اور سب کو حکم تھا کہ جیسے ہی وہ اپنی رائفل سے پہلی گولی چلائے۔ حملہ آور عربوں پر اندھا دھند فائرنگ کردی جائے۔

اب حملہ آور بالکل صاف نظر آرہے تھے۔ سلیم نے دیکھا کہ دور پہاڑ کی ایک چوٹی پر ایک گھوڑے سوار ظاہر ہوا۔ بالکل اچانک اس طرح جیسے کسی مجسمے میں روح پھونک دی گئی ہو۔ سوار نے چند لمحات تک چاروں طرف دیکھا اور پھر غائب ہوگیا۔ غالباً وہ نیچے اُتر رہا تھا۔

سلیم بھی اپنی رائفل سمیت اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ کسی بلند چٹان پر پہونچ کر حملہ آوروں کی تعداد کا صحیح اندازہ کرلے۔ درختوں اور بڑے پتھروں کی آڑ لیتا ہوا دبے پاؤں وہ ایک چٹان پر پہونچ ہی گیا۔ یہاں سے سڑک بالکل صاف نظر آرہی تھی۔ اب حملہ آور بالکل نزدیک تھے، سلیم نے اندازہ لگایا

— ان کی تعداد تیس سے زائد نہ تھی۔ سلیم نے اس چٹان پر تنہا آکر یقیناً بڑا زبردست خطرہ مول لیا تھا — وہ کسی لمحہ بھی حملہ آور عربوں کا نشانہ بن سکتا تھا لیکن آبنوس کے درختوں کی گہری چھاؤں اسکی سب سے بڑی مددگار ثابت ہوئی — اندھیرے کی آڑ لیتا ہوا وہ پھر اپنی جگہ واپس آگیا۔

یہاں طرانی بےچینی سے اسکی راہ دیکھ رہا تھا۔

"آقائے طرانی — ان کی تعداد تیس سے زائد نہیں ہے — اور سب گھوڑوں پر سوار ہیں — اور غالباً وہ ہم سب کو غافل سمجھ رہے ہیں کیونکہ ان کے آنے کا انداز انتہائی اطمینان و سکون کا مظاہرہ کر رہا ہے اور ان کی یہی غلط فہمی ان کی موت کا سبب بنے گی۔"

"بہر حال — خدا ہمیں اس جنگ میں کامیاب کرے۔" طرانی نے کہا۔

"کامیابی اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم یا تو تمام حملہ آور عربوں کو قتل کر دیں اور یا زندہ گرفتار کر لیں — کیونکہ اگر ان میں سے ایک بھی زندہ بچ کر نکل گیا تو ان کا اگلا حملہ انتہائی خوفناک ہوگا اور پھر ہم ان کی کثیر تعداد کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔" سلیم نے سرگوشی کی۔

"اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ ان کا رخ ہماری طرف نہ ہو اور وہ کسی اور طرف جا رہے ہوں —" طرانی نے پُر امید لہجے میں کہا

"ہاں — اسکا بھی امکان ہے — لیکن بہر صورت ہمیں جنگ

کے لیے بالکل تیار رہنا چاہیے۔"

دُور بہت دُور سے فائر کی آواز آئی۔ اور سلیم نے دیکھا کہ ایک عرب گھوڑے سوار آگے بھاگ رہا ہے۔ "یقیناً یہ کوئی اور بات ہے۔ یہ حملہ ہم پر نہیں ہے۔ بلکہ شاید اسی گھوڑے سوار کا تعاقب کیا جا رہا ہے" سلیم نے سوچا اور پھر صورت حال کا اندازہ کرنے لگا۔

سلیم کا اندازہ بالکل درست نکلا۔ حملہ آور عرب اپنے کسی دشمن کا تعاقب کر رہے تھے۔ تقریباً بیس منٹ کے اندر سڑک بالکل صاف ہو گئی۔ اور تعاقب کرنے والے عرب اپنے دشمن پر فائرنگ کرتے ہوئے بہت دُور نکل گئے۔

"میں نتیجہ سے بالکل نا امید ہو گیا تھا۔" طہرانی نے عازم الدین سے کہا۔

"اور میں ہر انجام کیلئے تیار تھا۔" سلیم نے مطمئن انداز میں کہا۔

"خیر۔ باورچی سے کہو کہ سب کے لیے قہوہ تیار کرے۔ اور اس کے بعد سو یا جائے۔ ہمارے سفر کا سب سے اہم دن کل ہو گا۔ اس لیے کہ ہمیں کل شہزادی کو بیدار کرنا ہے۔"

حسن کا انتظار کیے بغیر قہوہ پی کر تمام افراد اپنے اپنے خیموں میں واپس سونے کے لیے چلے گئے۔

سلیم بھی رائفل سرہانے رکھ کر سو گیا۔

اسی رات سلیم نے خواب دیکھا کہ وہ بالکل تنہا شہزادی کے مقبرہ میں

کھڑا ہے اور کسی نامعلوم راستے سے داخل ہوا ہے۔۔۔ گلابی پتھر پر شہزادی کا تابوت بالکل اسی طرح رکھا ہوا ہے جس طرح اس نے دن میں دیکھا تھا۔ اچانک نہایت آہستہ آہستہ تابوت کا ڈھکن اوپر اٹھنے لگا۔۔۔

پھر ایک مرمریں ہاتھ تابوت سے بلند ہوا، مخروطی انگلیوں نے کوئی اشارہ کیا۔۔۔ مقبرہ کی نیم تاریکی میں ایک ہلکی سی روشنی تابوت سے نکل کر باہر پھیلی کہ اچانک فضا میں ایک بھیانک قہقہہ بلند ہوا۔ "زلیخا۔۔۔ تم اپنے محبوب احمس سے نہیں مل سکتیں۔۔۔ تمہارا منگیتر۔۔۔ ایسا ہرگز نہ ہونے دیگا۔۔۔"

اور تابوت کا ڈھکن دوبارہ بند ہو گیا۔۔۔

سلیم کی آنکھ کھل گئی۔۔۔ اسکا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، خوف سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔۔۔ وہ پلنگ سے اتر کر خیمہ کے باہر آیا ۔۔۔ چاند کی مدھم روشنی میں حسن اصغر ریت پر دبے پاؤں ٹہل رہا تھا۔۔۔

"میں اس لیے نہیں سو رہا ہوں کہ مجھے اسپاتا کی خبیث روح سے ہر وقت خطرہ ہے۔۔۔ اور وہ تم پر کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے۔۔۔"

حسن اصغر نے پرسکون انداز میں کہا۔۔۔ اور پھر ٹہلنے لگا۔۔۔ "میں جانتا ہوں تم یقیناً اپنا کوئی بھیانک خواب سنانے کے لیے میرے پاس آرہے ہو گے لیکن سلیم۔۔۔ خوابوں کے پیچھے دوڑ کر پریشان نہ ہو۔۔۔"

"نہیں حسن اصغر۔۔۔ میں قطعی پریشان نہیں ہوں اور اب تو مجھے بھی سب کچھ یاد آگیا ہے۔۔۔"

"کیا یاد آگیا ہے"

"یہی کہ میرا نام احمس ہے"

"لیکن احمس — تمہیں عرت سیدؐ اول کے دور کے وہ واقعات یاد آئے ہونگے جو تمہاری موت تک ہوئے تھے"

"ہاں —"

"لیکن مجھے تمہارے بعد — اور اپنے بعد تک کے تمام واقعات یاد ہیں — خدا کی قسم اگر میں اس ۳½ ہزار سال پرانی تاریخ کو لکھنے بیٹھوں تو دنیا انگشت بدندان رہ جائے گی"

"مثلاً —" سلیم نے اضطرابی انداز میں کہا۔

"مثلاً میں یہ بتاؤں کہ اسی مصر نے دنیا کی سب سے پہلی مطلق العنان ملکہ "حطشی پط" پیدا کی تھی جس نے پورے بائیس سال تک دنیا کے سب سے زیادہ خوشحال، مہذّب اور طاقتور ملک کو اپنی مٹھی میں دکھا تھا۔ اسی مصر نے دنیا کا پہلا بین الاقوامی فاتح تومس پیدا کیا تھا جس نے موجودہ مشرقِ وسطیٰ پر پورے انیس حملے کیے اور مصر کو ایک نئی تہذیب، ایک نئی دولت اور زندگی کی ایک نئی کروٹ سے روشناس کرایا — اور اسی مصر نے تاریخ انسانی کے پہلے موحد فلسفی، مفکر، شاعر، اور بادشاہ اخناتون کو پیدا کیا جس نے دنیا کو توحید کا اولین درس دیا اور بت پرستی کی اعلانیہ مخالفت کی۔

سلیم — مصر کا ہر گوشہ، اور ہر گوشہ میں پھیلا ہوا ہر پتھر ایک مکمل

تاریخ ہے اور میں اس تاریخ کا آنکھوں دیکھا مورخ ہوں ۔۔۔ ایک ایسی تاریخ کا مورخ جو کتابوں میں نہیں ملتی ، پرانے کتبوں میں نہیں ملتی ۔۔۔ اہرام کے نقش و نگار میں نہیں ملتی ۔۔۔۔

مثال کے طور پر تھیبس کے سامنے نیل کے کنارے مغربی کنارے پر "دیر البحری" نام کا ایک قدیم مندر موجود ہے جس کے بارے میں مورخ صرف یہ جانتے ہیں کہ :۔ مصر کی پہلی ملکہ "حطشی پسط" نے اپنی یادگار بطور بنوایا تھا ۔۔ آج کے سیاح اس کے طرزِ تعمیر اور دل نشین نقاشی اور مصوّری دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں ۔ لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ ملکہ نے یہ عظیم الشان مندر کیوں تعمیر کر دیا ۔ جبکہ مصر میں اُس وقت بھی آمن دیوتا کے اور بھی لاتعداد مندر موجود تھے ۔۔۔

خدا کی قسم سلیم ۔۔۔۔ میں اس وادی کی پوری تاریخ جانتا ہوں ، اس وادی میں موت کی ابدی نیند سونے والے ہر مصری فرمانروا کی داستان جانتا ہوں ۔۔۔ اور صرف اس لیے جانتا ہوں کہ مجھے زلیخا کی مسلسل نیند ناپسند تھی ، میں اس کو بیدار کرنا چاہتا تھا ۔۔۔ میں اس کو اس کے بچھڑے محبوب سے ملانا چاہتا تھا اور میں اپنی وہ قسم پوری کرنا چاہتا تھا جو میں نے اس کے تابوت کا ڈھکنا بند ہوتے وقت کھائی تھی ۔۔۔

سلیم ۔۔۔ ہر زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوتا ہے اور جب یہ مقصد پورا ہو جاتا ہے تو زندگی تھک جاتی ہے ، تھک کر سو جاتی ہے ۔۔۔ اور دنیا کہتی ہے فلاں انسان مر گیا ۔۔۔

میری زندگی کا بھی ایک مقصد ہے ۔۔۔ یہی وہ مقصد تھا جس نے صدیوں تک مجھے مختلف ناموں سے زندہ رکھا اور جب مجھے اپنا مقصد اور اپنا مقصد یاد رہا ۔۔۔ سوچتا ہوں کل جب زلیخا کی بیداری کے بعد یہ مقصد پورا ہو جائیگا ۔۔۔ تو میری زندگی بھی بے مقصد ہو جائیگی اور ظاہر ہے کہ بے مقصد زندگی کی منزل موت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی ۔"

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھ پایا گیتاری ۔۔" سلیم کو الجھن سی ہونے لگی ۔

"مطلب بالکل صاف اور واضح ہے سلیم ۔۔۔ تم جس گیتاری کو حسن صغر کے روپ میں دیکھ رہے ہو وہ ہزاروں سال پہلے مر چکا تھا لیکن ایک مقصد کی خاطر موت اس پر قابو پا لیتی رہی اور رہا کرتی رہی ۔۔۔ اور وہ مختلف نام بدلتا رہا ، اس کی روح ایک رہی ، جسم ایک رہا ، خد و خال ایک رہے ، ذہن ایک رہا ۔۔۔ صرف نام بدلتے رہے ۔۔ اور وقت تیزی سے بھاگتا رہا ۔۔۔ اب تم خود بتاؤ کہ جب یہ مقصد حاصل ہو جائیگا تو گیتاری کی زندگی کیا ۔۔۔ جو مرنے کے باوجود زندہ تھا کیا ضرورت باقی رہ جائے گی ۔۔۔ اور پھر زندہ رہتے رہتے ۔۔ دنیا دیکھتے دیکھتے ، قوموں کا عروج و زوال دیکھتے دیکھتے ، تہذیب و تمدن کا اتار چڑھاؤ دیکھتے دیکھتے تمہارا گیتاری بھی تھک گیا ہے ۔۔۔ اور وہ بھی اپنے اسلاف کی طرح ایک گہری اور نہ بیدار ہونے والی ابدی نیند سو جانا چاہتا ہے ۔۔"

یعنی ۔۔۔ تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زلیخا کے بیداری کے بعد

— تم ہم دونوں کو —" سلیم یہاں تک کہنے پایا تھا کہ حسن اصغر نے بات کاٹ دی ۔

"ہاں — میں تم دونوں کو ہی نہیں، — اس فانی دنیا کی ہر شے کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا — سلیم — اگر کل شہزادی بیدار ہو تی ہے تو تم یوں سمجھ لو کہ آج کی رات تمھارے دوست گیتاری کی زندگی کی آخری رات ہے — مجھے پورا یقین ہے کہ میں کل شام کا ڈوبتا ہوا سورج اپنی مادّی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں گا"

"نہیں حسن اصغر — ایسا نہیں ہو سکتا —" سلیم تقریباً چیخ پڑا ۔

"ایسا ہو کر رہیگا سلیم — زلیخا بیدار ہو گی تو گیتاری اپنا آخری رختِ سفر ضرور باندھے گا — اس لیے تم — یعنی تم سب میری وصیت بھی سُن لو — قدیم دستاویز میں زلیخا کی بیداری کے لیے جن دواؤں کا تذکرہ ہے وہ میں نے ترتیب سے اس کے تابوت کے پاس والی تپائی پر رکھدی ہیں — یہ دوائیں پہلے سے ہی کمرے کی ایک سنگی الماری میں موجود تھیں — کوئی دوا اور کوئی عمل کب کم نہیں ہے — جیسے ہی زلیخا بیدار ہو کر اپنی زندگی کی پہلی انگڑائی لے گی — اور جیسے ہی وہ اپنی لانبی پلکوں کو اٹھا کر ہم دونوں کو دیکھے گی — اور جیسے ہی اس کے شبنم سے زیادہ پاکیزہ اور پھولوں سے زیادہ نازک لبوں پر کنواری مسکراہٹ پھیلے گی — میرا مقصدِ حیات پورا ہو جائیگا ۔

اور پھر میری آنکھیں بند ہونے لگیں گی — اور میں محض چند لمحات

گے اندر اپنے اسلاف کے مسکن کی طرف واپس لوٹ جاؤں گا۔ میرا بے جان جسم وہیں اکڑ کر رہ جائے گا۔

میری کوئی قبر نہ بنانا سلیم ۔ زلیخا کا تابوت خالی ہوگا۔ بس تم اسی تابوت میں مجھے لٹا دینا، اسکا ڈھکن بند کر دینا اور پھر جب زلیخا کو لیکر مقبرہ سے باہر نکلنا تو مقبرہ کا داخلی دروازہ بھی بند کر دینا۔

سلیم ۔ تمھیں کل کے بعد ایک نئی زندگی شروع کرنا ہے ایک ایسی زندگی جس کا ارمان زلیخا کی ہر سانس میں موجود تھا۔ اس لیے میری موت پر ایک بھی آنسو نہ بہانا ۔ غم کا کوئی اظہار نہ کرنا ۔ چہرہ پر ملال کی ایک بھی لکیر نہ پیدا ہونے دینا ۔ اور مڑ کر بھی میرے تابوت کی طرف نہ دیکھنا ۔

اسیاتا کا خبیث وجود میرے ذہن میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے لیکن ابھی کافی وقت ہے، زلیخا کی بیداری سے قبل ہی میں اس کا بھی بندوبست کر دونگا اور وہ بھی تم دونوں کے مقابلہ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو کر رہ جائے گا۔ سلیم زندگی ایک بڑی پیاری چیز کا نام ہے اس لیے آخری سانس تک اسکا لطف اٹھانا ۔ یہی زندگی کی سب سے بڑی سعادت ہے۔"

حسن اصغر ابھی اور کچھ کہتا لیکن سلیم نے اسکی بات کاٹ دی ۔" اسکا مطلب یہ ہے کہ زلیخا کی بیداری کے لیے مجھے اپنے دوست کو قربان کرنا پڑے گا ۔ میں ایک زندگی دیکر دوسری زندگی لونگا ۔ نہیں حسن اصغر ۔

نہیں گپتا ری ایسا نہیں ہو سکتا۔۔۔ تم نے اپنی وصیت بیان کر دی۔۔۔ اب میرا بھی آخری اور اٹل فیصلہ سُن لو۔۔۔

اگر زلیخا کی بیداری کا مطلب حسن اصغر کے نیک وجود کی موت ہے تو زلیخا کبھی بیدار نہ ہو گی۔۔۔ وہ سو رہی ہے اور سوتی رہے گی۔۔۔"

"بچوں کی سی باتیں نہ کرو سلیم۔۔۔ کہانی کو ختم ہونا ہے اس میں مزید الجھنیں نہ پیدا کرو۔۔۔ اب اس داستان کا باب بند ہی ہو جانا چاہیئے۔۔۔ زلیخا سوتے سوتے تھک گئی ہے اور میں جاگتے جاگتے تھک گیا ہوں۔۔۔ اور اب جبکہ میں سب کچھ تم کو بتا چکا ہوں مجھے پوری امید ہے کہ تم میری وصیت پر لفظ بہ لفظ عمل کرو گے۔۔۔ اچھا اب جاؤ۔۔۔ سو رہو۔۔۔ کل دن میں ہم سب کو بے انتہا کام کرنا ہے۔۔۔"

"میں جا رہا ہوں۔۔۔ لیکن حسن اصغر اتنی بات یاد رکھنا کہ اب زلیخا سوتی ہی رہے گی۔۔۔" سلیم دل شکستہ ہو کر معاملہ کے اس نئے پہلو پر غمزدہ ہو کر وہاں سے چلا آیا اور حسن اصغر چاندنی میں نہائے ہوئے ایک بت کی طرح وہیں کھڑا رہا۔۔۔

وادی میں بالکل سناٹا طاری تھا۔۔۔ ہوا سرد ہو کر آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔۔۔ کھجور کی شاخیں دم بخود کھڑی تھیں اور دور نیل کا پانی اچھل اچھل کر بہہ رہا تھا۔۔۔

حسن اصغر نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔۔۔ گردن گھما کر چاروں طرف

دیکھا۔۔۔ ماحول کی اداسی پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔۔۔ پھر سلیم کے خیمہ اور زلیخا کے اونچے مقبرہ کی طرف دیکھا۔۔۔ گویا نظروں ہی نظروں میں وہ سب کو الوداعی سلام کر رہا ہو۔۔۔۔

باب ــــــــ ۱۵

"ذات عربوں کے غیر متوقع حملے نے تو میرے حوصلے پست کر دیئے" ناشتہ کی میز پر ڈاکٹر بیگ نے کہا اور پروفیسر نے گردن ہلا کر اپنی طرف سے بھی اس خیال کی تصدیق کر دی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" عاذم الدین نے کہا "بخدا میں تو ابتک کمزوری محسوس کر رہا ہوں ـــ حالانکہ بظاہر اب کوئی خطرہ نہیں رہا" یہ کہہ کر اس نے فرشت جانے والی سڑک پر جو دور سے ایک موٹی لکیر معلوم ہو رہی تھی غور سے دیکھا۔

"حسن اصغر کی بروقت خبر نے ہم سب کو ہوشیار کر دیا ـــ ورنہ اگر واقعی حملہ ہوتا تو ہم سوتے کے سوتے ہی رہ جاتے" پروفیسر نے چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے کہا۔

"واقعی وہ بہت ہوشیار اور نیک آدمی ہے۔" طہرانی نے کہا۔

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ وہ ہمیں مل گیا یا کسی اسرار کے تحت خود اس نے ہمیں تلاش کر لیا ـــــ دوستوں ـــــ میرا تو خیال ہے کہ ایسا شخص اب مصر میں کبھی پیدا نہ ہوگا ـــــ کیونکہ اس میں یقیناً بعض ایسی صفات ہیں جو صرف فوق البشر میں ہی ہوتی ہیں ـــــ"

"خیر ـــــ اب آج کا کیا پروگرام ہے ـــــ" عازم الدین بولا۔

"تابوت کا زرّیں ڈھکن کھولنا ـــــ اور شہزادی کا دیدار کرنا۔" طہرانی نے جواب دیا۔

"بالفرض محال اگر یہ مان لیا جائے کہ تابوت خالی ہوگا ـــــ تو ـــــ" ڈاکٹر بیگ ہمیشہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھنے کا عادی تھا۔

"نہیں ـــــ وہ خالی نہیں ہوگا ـــــ دستاویز کے بموجب اس کا ڈھکن رعمیس کے دورِ حکومت کے بعد آج تک نہیں کھولا گیا ـــــ" طہرانی نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"لیکن میرا دل کہتا ہے کہ تابوت نہ کھولا گیا ہو تب بھی اس مقبرہ میں ہمارے علاوہ کچھ اور بھی لوگ کبھی نہ کبھی ضرور داخل ہوئے ہونگے ـــــ اور میری اس بات کی دلیل یہ ہے کہ مقبرہ میں زلیخا سے متعلق کوئی سامان موجود نہیں ہے جبکہ قدیم مصر میں یہ رواج تھا کہ وہ مقبرہ میں مردے کی ہر چیز رکھ دیا کرتے تھے اور تمام کمروں کو آرائش کے انداز میں سجا دیتے تھے۔" ڈاکٹر بیگ نے رائے دی۔

"آپ کی بات قرین قیاس ضرور ہے، ہو سکتا ہے عرب بدوؤں کا کوئی گروہ کسی کونے دیوار توڑ کر اسمیں داخل ہوا ہو اور تمام سامان اٹھالے گیا ہو۔ لیکن تابوت کھولا گیا ہے یہ بات میں نہیں مانتا۔" طرانی نے جواب دیا۔

"لیکن — کیوں —؟" عازم الدین نے دریافت کیا۔

"اس لیے کہ تابوت کا ڈھکن کافی وزنی ہے وہ توڑا جا سکتا ہے اٹھایا نہیں جا سکتا — اور چونکہ وہ ہمیں بالکل صحیح وسالم ملا ہے اسلیے تابوت ان چوروں سے محفوظ رہا۔" طرانی نے زور دے کر کہا۔

"جب آپ کا یہ استدلال ہے تو آخر ہم اس وزنی ڈھکن کو کس طرح اٹھائیں گے —" ڈاکٹر بیگ نے سوال کیا۔

"اس کے لیے ہمارے پاس ایک جیک[1] موجود ہے، بمبئی میں جہاں میں نے اور سامان خریدا تھا وہاں یہ آلہ بھی خرید لیا تھا۔" طرانی نے مسکرا کر کہا۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ناشتہ کے فوراً بعد تمام ضروری سامان مقبرہ کے اندر پہنچا دیا جائے — اور ہاں — ابھی تو آپ کو وہ اشیاء بھی مقبرہ میں تلاش کرنی ہیں جن کے بغیر زلیخا کی بیداری محال ہے اور جن کا تذکرہ قدیم دستاویز میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔"

"وہ میں تلاش کر چکا ہوں —" خیمہ میں داخل ہوتے ہوئے حسن صخر نے بالکل ڈرامائی انداز میں کہا "آپ لوگوں کے علم کے بغیر میں تمام

---

[1] جیک - ایک آلہ ہوتا ہے جس کی مدد سے وزنی چیز آسانی سے اٹھالی جاتی ہے۔

ذات زلیخا کے مقبرہ میں موجود رہا اور میں نے تابوت کے قریب والی تپائی پر تمام دوائیں، تیل اور مرکبات ترتیب سے رکھ دیئے ہیں۔"

"کم از کم مجھے یعنی آقائے طہرانی کو تمھاری ذات سے یہی امید تھی۔"

"شکریہ۔" حسن اصغر نے مسکرا کر کہا۔ "اور اب ہمیں وہاں جانے میں تاخیر نہ کرنا چاہیئے۔ زلیخا کی بیداری کا کام جس قدر جلد ختم ہو جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

اور سلیم کی آنکھیں اس تصوّر سے ہی کانپ گئیں کہ جو حسن اصغر زندگی کی بھرپور ساعتوں کے ساتھ اس وقت ہم سب کی نگاہوں کے سامنے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہا ہے وہ زلیخا کے بیدار ہوتے ہی مر جائیگا۔

حسن اصغر نے سلیم کے چہرے کے یہ تأثرات بھانپ لیے اور فوراً خیمہ کے باہر چلا گیا۔ سلیم نے چاہا کہ وہ اس وقت جبکہ پارٹی کے تمام افراد ایک ہی جگہ موجود ہیں اب تک کی پوری داستان بیان کر دے۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ ایسا نہ کر سکا۔ زلیخا کی محبت، اسکا حسن، اس کی نیلی آنکھیں، اسکا مرمریں جسم، اس کی مخروطی انگلیاں، — اس کا شباب سے بھرپور جسم، اور اس کے انتظار کے طویل لمحات اسکے جذبات پر حاوی ہو گئے۔ اور وہ خاموش رہ گیا۔

دس بجتے بجتے حسن اصغر کی قیادت میں پوری پارٹی تمام ساز و سامان کے ساتھ شہزادی کے مقبرہ میں داخل ہو گئی۔

پہلی سُرنگ کے خاتمہ پر سلیم نے حسن اصغر کے چہرے پر نظر ڈالی ۔۔ اور کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے خفیف سے فاتحانہ تبسم کو دیکھ کر خاموش ہو گیا ۔۔ غالباً دونوں اپنے اپنے فیصلوں پر قائم تھے۔۔۔ لیکن ایک کا فیصلہ آہنی تھا اور دوسرے کا نیم آہنی ۔۔ ایک کا تعلق انسان کی وفا سے تھا اور دوسرے کا جوانی کے اندھے جذبات سے۔۔۔

تابوت کے قریب پہنچ کر طرانی نے چار مشعلیں جلا کر کمرے کے چاروں گوشوں میں نصب کر دیں اور اس طرح پورا کمرہ روشن و منور ہو گیا ۔۔ تیز روشنی میں سلیم نے دیکھا کہ تابوت کے پتھر پر کوئی عبارت کندہ نہ تھی لیکن مقبرہ کی دیواروں پر نہایت خوبصورتی سے رنگ و روغن کیا ہوا تھا۔۔۔

کمرے میں بےحد گرمی تھی ۔۔ فضا میں گھٹن سی تھی اور ہر شخص خاموش تھا لیکن طرانی سے یہ خاموشی برداشت نہ ہوئی اس نے اپنی بھاری آواز میں کہا ۔۔ "شہزادی زلیخا کا نام جابجا کندہ نظر آتا ہے ۔۔ کمرے کی زیب و زینت کا بھی معماروں نے کافی خیال رکھا ہے ۔۔ یقیناً یہاں سنگ تراشی کے ذریعہ اپنے دور کی بہترین تصاویر نقش کی گئی ہیں ۔۔ یہ نیل کے گہرے پانی پر کشتیوں کے جلوس ۔۔ کاہن کی عارفانہ بیخودی ۔۔ تجہیز و تکفین کی رسومات کی تکمیل کا منظر اور اسی قسم کے دوسرے مناظر اپنی نوعیت کے اعتبار سے انتہائی آفرین طلب ہیں۔۔۔

قدیم مصریوں کے نزدیک کنول کا پھول اور آئینہ ۔۔ حیاتِ جاوید کی نشانیاں تھیں اور یہ دونوں چیزیں بھی کمرے کی دیواروں پر جگہ جگہ

بجا ہیں۔۔۔ طرانی نے اپنی بات ختم کر کے سلیم کی طرف دیکھا۔ جو گردن جھکائے ایک عالم بیخودی میں تابوت کو دیکھ رہا تھا، اس کے چکنے پتھر کو چھو رہا تھا اور بار بار ٹھنڈی سانسیں لے رہا تھا۔۔۔

نزدیک کی تپائی پر طشتریاں، پیالے، شیشیاں اور سونے کے بنے ہوئے سات چراغ رکھے ہوئے تھے۔۔۔ اور یہی وہ چیزیں تھیں جو زلیخا کی بیداری میں استعمال ہونے والی تھیں، ڈاکٹر بیگ کبھی تابوت کی طرف دیکھتا اور کبھی تپائی پر رکھے ہوئے سامان کی طرف۔۔۔ اسی اثناء میں اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک شیشی کو جس میں کوئی سیال مادّہ بھرا ہوا تھا اٹھانا چاہا۔۔۔ کہ طرانی چیخ پڑا۔۔۔ "نہیں ڈاکٹر۔۔۔ ابھی کوئی شئے مت چھوئیے۔۔۔"

اور کبیدہ خاطر ہو کر ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔۔۔

"تپائی پر رکھی ہوئی چیزیں وہی ہیں جن کا قدیم دستاویز کے ضابطہ میں اندراج ہے، یہی وہ عناصر ہیں جو آج سے تقریباً تین ہزار سال قبل دیوتا رع کے آخری کاہن نے زلیخا کو جگانے کے لیے متاخرین کے لیے ترتیب دے دیئے تھے۔۔۔"

"ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے مجھے اس پر حیرت ہے کہ اتنا طویل عرصہ گذرنے کے باوجود ان دواؤں میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے، ۔۔۔ نہیں طرانی۔۔۔ یقیناً یہ کوئی سحر ہے اسکا تعلق علم طب سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔۔۔ ڈاکٹر بیگ کے چہرے پر واقعی حیرانی ٹپک رہی تھی۔۔"

"یہ کوئی نیا خیال نہیں ۔۔ ناقابلِ یقین باتوں اور مظاہر دں کو انسان نے ہمیشہ سے سحر کہا ہے" طہرانی نے ذرا سخت لہجے میں کہا ۔۔ "بہر حال جو کچھ ہے وہ ہمارے سامنے ہے ۔۔ اور اب ہمیں ڈھکن کھولنے کی تیاری کرنا چاہیے ۔۔"

عازم الدین گرمی کی شدت کی وجہ سے ابھی سے حد درجہ تکان محسوس کر رہا تھا وہ چاہتا تھا کہ بیداری کا کام جلد از جلد ختم ہو جائے ۔۔ چنانچہ اس نے طہرانی کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا "تابوت کا ڈھکن اٹھانے میں اندازاً کتنا وقت صرف ہوگا ۔۔"

"جو آلات ہمارے پاس ہیں ان کی مدد سے زیادہ وقت صرف ہونے کا امکان نہیں ہے لیکن پھر بھی ایک گھنٹہ ضرور لگے گا کیونکہ کام شروع کرنے سے پہلے حفاظتی احتیاط اور بہت سی دیگر تدابیر ضروری ہیں ۔۔"

حسن اصغر نے گفتگو میں کوئی دلچسپی نہ لی ۔ وہ غور سے پروفیسر اشرف کے اکتائے ہوئے چہرہ کو دیکھ رہا تھا ۔۔ آخر اس سے رہا نہ گیا اور اس نے دھیمی آواز میں پروفیسر کو مخاطب کر کے کہا ۔۔ "غالباً اس وقت بھی آپ یہی سوچ رہے ہیں کہ شہزادی زلیخا کی روایت بے بنیاد ہے، اس نام کی شہزادی کا کوئی وجود نہ تھا بلکہ یہ ان مذہبی پیشواؤں کا گھڑا ہوا کوئی افسانہ ہے جو کمزور اعتقاد مصریوں کو بیوقوف بنانے کے لیے تصنیف کیا گیا تھا ۔۔ لیکن پروفیسر صاحب دو گھنٹے کے اندر جب زلیخا اپنی جھیل ایسی شفاف اور پرسکون آنکھیں کھول کر آپ سب کو دیکھے گی تو آپ کی غلط فہمی دور ہو جائیگی

اور غالباً اس کے بعد آپ خود اپنے بارے میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ علم کیمیا اور طب قدیم کے بارے میں آپ نے اب تک جو کچھ پڑھا تھا اس کی حیثیت ابتدائی درس سے زیادہ نہیں ہے ۔۔"

لیکن پروفیسر نے حسن اصغر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا ۔۔

طرانی اور دیگر مزدور تابوت کے قریب جیک نصب کرنے لگے ۔۔ کام میں انہماک پیدا ہو گیا ۔۔ خاموشی کے باوجود سلیم کے علاوہ ہر شخص کے چہرے پر جوش اور خوشی کے ملے جلے جذبات موجود تھے ۔۔ ڈاکٹر بیگ اب بھی سوچ رہا تھا کہ تپائی پر رکھی ہوئی دوائیں اور دیگر مرکبات ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی دور حاضرہ تک کیسے باقی رہ سکتے ہیں ۔۔"

سب کو اپنے اپنے کاموں میں مصروف دیکھ کر سلیم نے انتہائی آہستہ آواز میں حسن اصغر سے کہا ۔۔ "گیتاری ۔۔ کیا واقعی رات کو تم نے جو کچھ کہا ہے تم اس پر عمل کرو گے ؟"

"ہاں احمس ۔۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ۔۔ پھر مجھے شاید نہیں معلوم کہ بیداری کے بعد اپنی موت روکنا میرے اختیار میں بھی نہیں ہے ۔۔ میں مجبور ہوں احمس ۔۔ قدرت اور قانون قدرت سے لڑنے کی طاقت نہ مجھ میں ہے اور نہ تم میں ۔۔"

"لیکن اگر شہزادی بیدار نہ ہوئی تو ۔۔"

"یہ بالکل ناممکن ہے ۔۔ گیتاری کی زندگی میں یہ بالکل ناممکن ہے ، زلیخا ضرور زندہ ہو گی اور گیتاری اس دنیا سے ضرور چلا جائے گا ۔۔

احسن ۔ مجھے اس بارے میں اتنا یقین ہے جس طرح شام کو سورج ڈوبنے کا یقین ہے ۔ اور اسکا ثبوت یہ دیکھو ۔" اور یہ کہہ کر حسن اصغر نے اپنی مصری عبا کا دامن اُٹھا کر سلیم کو اپنا اندرونی لباس دکھا دیا۔۔

عبا کے نیچے حسن اصغر کفن پہنے ہوئے تھا۔۔

"میں نے خود اپنے ہی ہاتھوں اپنا کفن پہن لیا ہے تاکہ تمھیں اور تمھارے ساتھیوں کو میری وصیت پر عمل کرنے میں کوئی دقت نہ ہو ۔"

اور سلیم ایک زندہ انسان کے جسم پر مُردوں کا کفن دیکھ کر کانپ گیا ۔ اس کو افسوس تھا کہ کوئی چیز اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا بھی کہ ہاتھ مار کر وہ تپائی پر رکھی ہوئی تمام ادویات پھینک دے اور اس طرح زلیخا کی بیداری ناممکن ہو جائے لیکن جیسے وہ سحر زدہ ہو چکا تھا۔ ارادے کے باوجود اس کے ہاتھوں کو حرکت نہ ہوئی ۔

حسب وعدہ ایک گھنٹہ کے اندر طرافی نے جیک کو نصب کر لیا اور ڈھکن اٹھانے کی تمام تیاریاں مکمل کر لیں ۔ تمام افراد جیک کے ساتھ تابوت کے نزدیک آ گئے ۔ لیکن قبل اس کے کہ جیک حرکت میں آتا حسن اصغر نے کہا " اس تابوت کے اندر انجیر کی لکڑی کا بنا ہوا ایک اور تابوت ہوگا جس پر نہایت نفاست اور خوبصورتی سے رنگ و روغن کیا ہوا ہوگا ۔ ہمیں اس کے لیے بھی تیار رہنا چاہیے کہ ہمیں اس

اندر والے تابوت کا ڈھکن بھی کھولنا ہے۔"

"حسن اصغر ــــ تم مجھے نادان نہ سمجھو ــــ قدیم دستاویز میں سب کچھ لکھا ہوا ہے اور یہ دستاویز میں متعدد بار پڑھ چکا ہوں ــــ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دستاویز میں لکھے ہوئے ضابطہ کی ہدایات کے بموجب اندرونی تابوت کھولنے کے بعد عمل بیداری شروع کرنے میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہ ہونا چاہیے ــــ"

"واللہ ــــ وہ منظر بھی کتنا عجیب ہوگا کہ شہزادی زلیخا نے اگر وہ ابھی تک واقعی زندہ ہے آخری بیداری سے قبل دراصل ہم اندر دیوتاؤں کے کاہنوں کو قدیم ترین مصری لباس میں اپنے مقبرہ کے چاروں طرف دیکھا ہوگا لیکن آج جب وہ بیدار ہوگی کے بعد اپنی آنکھ کھولے گی تو اسے فرعون کے بجائے طہرانی اور کاہنوں کے بجائے ہم سب اپنے مغربی اور نیم عربی لباس میں ملبوس نظر آئیں گے ــــ طہرانی ــــ میں سوچتا ہوں کہیں وہ ہم سب کو دیکھ کر ڈر نہ جائے ــــ وہ ہمیں بھوت نہ سمجھ بیٹھے ــــ یا ہمیں عالم بالا کے انسان سمجھ کر پاگل نہ ہو جائے۔" ڈاکٹر بیگ نے ازراہ تمسخر کہا ــــ لیکن طہرانی کے دل میں یہ بات تیر کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر ــــ ہم میں سے چند آدمیوں کو واقعی قدیم مصریوں جیسا لباس پہن لینا چاہیے ــــ" طہرانی نے کچھ سوچ کر کہا۔

"نہیں اسکی ضرورت نہیں ــــ ہم صرف یہ بندوبست کریں کہ جب شہزادی آنکھ کھولے تو سب سے پہلے اسکی نگاہ سلیم پر پڑے اور پھر

مجھ پر ـــ" حسن اصغر نے مداخلت کی۔ ـــ

"صرف سلیم اور تم پر کیوں ـــ؟" عازم الدین بیٹے کی حجت میں گھبرا گیا۔

"مجھ پر اعتبار کیجئے اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اس پر عمل کیجئے۔ رہا آپ کا یہ پدرانہ اور مشفقانہ سوال ـــ تو اس کا جواب آپ کو آئندہ ساعتوں میں مل جائے گا ـــ"

"خیر ـــ فی الحال اس سنگی تابوت کا ڈھکنا تو اٹھنے دو ـــ" طہرانی نے یہ کہہ کر جیک کی مشین کا بٹن دبا دیا۔ مشین کا آہنی پنجہ حرکت میں آیا۔ ـــ پتھر کھسکنے کی ایک ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ ـــ ایک انچ ـــ دو انچ ـــ تین انچ ـــ پتھر مسلسل اٹھ رہا تھا ـــ ہر شخص دم بخود تھا۔ سب کی نگاہیں اُٹھتے ہوئے پتھر پر جم کے رہ گئی تھیں۔ ـــ

دس منٹ کے اندر انتہائی حفاظت کے ساتھ مشین نے ڈھکن کو تابوت سے تین فٹ اوپر بلند کر دیا ـــ اور پھر سب نے تابوت کے اندر جو کچھ دیکھا اس نے دستاویز کی اصلیت اور صداقت کی مکمل تصدیق کر دی ـــ

پتھر کے تابوت کے اندر صنوبر کی لکڑی کا بنا ہوا ایک اور خوشنما کنول نما تابوت موجود تھا۔ جس کے ڈھکن پر شہزادی زلیخا کی ایک رنگین تصویر بنی ہوئی تھی ـــ بالکل اسی تصویر کی طرح جو خان بہادر عازم الدین کی لائبریری میں موجود تھی۔ ـــ فرق صرف اتنا تھا کہ اس تصویر میں زلیخا

کی نیلی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور وہ کھڑی ہوئی تھی لیکن اس تصویر میں اسکی آنکھیں بند تھیں اور وہ اپنے سینے پر دونوں ہاتھ رکھے ہوئے لیٹی ہوئی تھی۔ ــــــ

لکڑی کا یہ تابوت اور اس پر بنی ہوئی تصویر دیکھ کر مقبرہ میں موجود ہر فرد کا دل لرز گیا ــــــ

ویسی ہی پلکیں ــــــ ویسے ہی سنہرے بال، ویسا ہی سفید لباس ــــــ وہی ماہ پیکر ــــــ مصری حسن کا ہی شاہکار ــــــ سلیم کے خوابوں کا سکون ــــــ حسن اصغر کی زندگی کی منتہائے مقصود ــــــ شہزادی زلیخا کی عجوبہ روزگار تصویر ــــــ

یہ تصویر قدیم مصری فن کا معجزہ تھی یا فریب نظر ــــــ لیکن اے کاش اس تصویر کو دیکھنے کے بجائے کوئی شخص حسن اصغر کے چہرے کی طرف دیکھ لیتا جس پر بتدریج ایک لافانی سکون پھیلتا جا رہا تھا ــــــ

وفور جذبات سے سلیم کے مضبوط جسم میں رعشہ سا آگیا ــــــ "بس اسی تابوت میں دنیا کی حسین ترین عورت اپنے محبوب کے انتظار میں ہزاروں سال سے سو رہی ہے ــــــ"

کسی کو کچھ ہوش نہ تھا ــــــ ورنہ وہ یہ ضرور دیکھ لیتے کہ ڈرے اور سہمے ہوئے مصری مزدور انتہائی خاموشی کے ساتھ دبے قدموں مقبرہ سے باہر جا چکے ہیں ــــــ

"حیرتناک اور ناقابل تصور ــــــ" ڈاکٹر بیگ کی زبان سے بیساختہ نکلا

"لیکن ایک زندہ اور ٹھوس حقیقت ــــ" عازم الدین نے گویا تصدیق کی ـــــ۔

"مجھ میں اب مزید تاب ضبط نہیں ـــ میں اس صندوق کا ڈھکن بھی کھولنا چاہتا ہوں ـــ" طرانی کی آواز میں بھی ارتعاش موجود تھا ـــ

"نہیں ـــ بالکل نہیں ـــ" مقبرہ میں ایک تیز آواز گونجی "میں اپنے گیتا دی کو نہیں جانے دوں گا ـــ میری نظروں کے سامنے ایسا نہیں ہو سکتا ـــ ایسا نہیں ہو سکتا ـــ" اور پاگلوں کی طرح چیختا ہوا سلیم یہ کہتے ہی زلیخا کے سنگی تابوت پر گر پڑا ـــــ۔

وہ پوری طرح بے ہوش تھا۔

باب ——— ۱۶

اس خلاف توقع حادثے نے پارٹی کا پروگرام درہم برہم کر دیا، حیرانی اس پر تھی سلیم بیہوش کیوں ہو گیا۔۔۔ وہ کس کو جانے سے روکنا چاہتا ہے ۔۔۔ یہ گینادی کون ہے ۔۔۔ سب سے پریشانی عاذم الدین کو تھی ۔۔۔ اسکا اکلوتا بیٹا اس طرح بیہوش ہو جائے گا یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

"آپ پریشان نہ ہوں ۔۔۔ سلیم کو ابھی چند منٹ میں ہوش آجائے گا۔"
حسن اصغر نے سلیم کو فرش پر لٹاتے ہوئے کہا۔

"ہوش آئے یا نہ آئے ۔۔۔ آج کا کام ختم کیا جاتا ہے ۔۔۔ لکڑی کا تابوت کل دن میں کھولا جائیگا اور بید ادی کا کام بھی کل ہی کیا جائیگا۔"
طرادی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے کہ کام آج ہی ختم ہو جائے" حسن اصغر نے بجھے ہوئے انداز میں مداخلت کی۔

"نہیں ۔ میں کسی ذہنی الجھن یا اضطرابی کیفیت کے ساتھ اتنا اہم کام نہیں کر سکتا حسن اصغر ۔ اس کے بعد تم خود سمجھ دار ہو ۔" طہرانی نے فیصلہ کیا۔

پتھر کا ڈھکن مشین کی مدد سے دوبارہ بند کیا گیا اور بیہوش سلیم کو لیکر تمام افراد خیمہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

عازم الدین کی آنکھوں میں آنسو آ چکے تھے۔ بیہوشی اور اچانک بیہوشی ہر فرد کے لیے ایک راز سی بن گئی تھی ۔ صرف حسن اصغر جانتا تھا کہ ایسا کیوں ہوا اور سلیم کی اچانک بیہوشی کا راز کیا ہے ؟

"بیچارہ احمق ۔ اسے کیا معلوم تھا کہ تقدیر کی لکیروں کو کوئی نہیں مٹا سکتا ۔ گیتاری کی روانگی مقدر بن چکی ہے ۔ آج نہیں تو کل ۔ اسے تو جانا ہی پڑے گا۔"

خیمہ والوں کے لیے یہ شام بڑی اداس اور بے کیف تھی ۔ سلیم کو ہوش آ چکا تھا لیکن وہ بالکل خاموش رہا ۔ اس نے کسی کے سوال کا جواب نہیں دیا ۔ اور پلنگ پر ہی لیٹا رہا ۔ ادھر حسن اصغر کے اصرار پر یہ فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ مزدور بھاگ چکے ہیں اس لیے تمام رات مقبرہ کے چاروں طرف پہرا دیا جائے۔

بات معقول تھی اس لیے مان لی گئی ۔ اور طہرانی ، عازم الدین

ڈاکٹر بیگ، حسن اصغر اور پروفیسر ارشد نے مسلح ہو کر پہرہ دینا شروع کر دیا۔ مقبرہ کے چاروں کونوں پر ایک ایک آدمی کی ڈیوٹی تھی اور حسن اصغر کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ چاروں طرف گھومتا رہے ۔

ہوش میں آنے کے بعد سلیم کو تمام باتیں یاد آ گئیں ۔ اور یہ سوچ کر اسکا دل خوشی سے معمور ہو گیا کہ اس نے کم از کم ایک اہی دن کے لیے اپنے دوست کی زندگی بڑھا دی ۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ زلیخا کے سلسلے میں اسکی بیتابی کا یہ عالم تھا کہ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اسی وقت تابوت کا ڈھکن اٹھا کر مصروف خواب کو باہر نکال لیتا ۔ سلیم ان دل خوش کن تصورات میں مگن تھا اور ادھر حسین چاندکی خوبصورت اور سیم افشاں چاندنی میں جو وادیٔ بیگمات فرعون میں پھیلی ہوئی تھی پانچوں آدمی مستعدی سے اپنے فرض کی تکمیل کر رہے تھے ۔

آج کے حادثے نے عازم الدین کو سب سے زیادہ لرزاں کیا تھا ۔ یہ ٹھیک ہے کہ اسے مصریات سے دلچسپی تھی ، اس کو مصر کی قدیم چیزوں سے محبت تھی اور اسکا یہ شوق جنون کی حد تک بڑھ چکا تھا لیکن بہر حال اب وہ عمر کے اس آخری دور میں تھا جہاں پہونچ کر انسان کو ہنگامہ آرائیوں سے ہٹیں سکون و اطمینان سے پیار ہو جاتا ہے ۔ وہ ہرگز ہرگز اس سخت مہم کا پروگرام نہ بناتا لیکن سلیم کو پریشانیوں سے نجات دلانے کے لیے اس نے اس دشوار کام کا بیڑہ اٹھا لیا تھا ۔

اس وقت بھی جبکہ وہ مقبرہ کے شمال مغربی گوشے پر ایک پتھر پر

بیٹھا پہرہ دے رہا تھا خیالات ذانکار کا ایک ہجوم اس کے دماغ کو پریشان کر رہا تھا ــــ اس نے اپنے کسی ساتھی کو آج تک یہ بات نہیں بتائی تھی کہ وہ بھی اکثر رات کی تاریکیوں میں زلیخا کو لباس مجازی میں کئی بار دیکھ چکا تھا ــــ اسی زلیخا کو جو اس وقت تابوت میں سو رہی تھی اور جس کی تابوت پر بنی ہوئی تصویر کو دیکھ کر اسکی آنکھوں میں اندھیرا سا چھا گیا تھا ــــ اب اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا ــــ "اگر زلیخا بیدار ہو گئی تو اس کی بیداری کے بعد کیا ہو گا" ــــ رات بڑھتی گئی اور عازم الدین کی پریشانیاں بڑھتی گئیں ــــ سامنے حد نظر تک قدیم کھنڈروں کے ویرانے پھیلے ہوئے تھے ــــ اور چاندنی رات میں ان کے سائے اس طرح گھٹ بڑھ رہے تھے جیسے اس عفریت آباد وادی میں دراز قامت غیر انسانی وجود جھک جھک کر آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں ــــ

اپنی رائفل کو ایک چٹان کے سہارے لگا کر اس نے سگریٹ سلگایا اور ان پراگندہ خیالات سے اپنے ذہن کو پاک کرنے کی کوشش کی جو اسکو پریشان کر رہے تھے ــــ لیکن پھر بھی ایک لمحہ کے لیے اس نے سوچا کہ اگر واقعی ان دفن شدہ مصریوں کی روحیں اپنے مقبرہ کی سیر کرنے کے لیے آتی ہوں گی تو ہم سب کو دیکھ کر ان کو کتنا اشتعال آتا ہو گا ــــ کہ ہم ان کی ابدی کے ہیبتناک سکون میں مخل ہو رہے ہیں ــــ

بہرحال وہ ان ہی خیالوں میں الجھا رہا، ایک لرزہ خیز اضطراب

اس کے دل و دماغ میں انتشار کی کیفیت پیدا کرتا رہا، اس کی کنپٹیاں بڑھتی گئیں لیکن پھر اس نے خود کو تسکین دیتے ہوئے کہا "کہ اس نے یہاں آ کر تاریخ کے اوراق سے فنا ہو نے والے فرعون کے خلاف کوئی علم بغاوت نہیں بلند کیا ہے بلکہ اس کے مشن کی خدمت کی ہے ۔۔۔۔ وہ سب اس تاریخی تجربہ کی تکمیل کر رہے ہیں جو ہیکل اعظم کے کاہن نے سیتی اول کے سامنے رکھی تھی اور وہ فرعون کے اس خواب کو ممکن بنانے کی جدوجہد کر رہے ہیں جس کے ذریعہ مصر کا یہ عظیم الشان فرعون مستقبل بعید کے لوگوں کو اپنی شوکت و عظمت کی آنکھوں دیکھی داستان سنوانا چاہتا تھا ۔۔۔۔"

چنانچہ اس معقول دلیل سے اس کے بے چین دل کو بہت کچھ سکون ملا اور وہ غیر انسانی خوف جو اس پر غالب آ چکا تھا بتدریج ختم ہونے لگا ۔۔۔۔ لیکن یہ کیا ۔۔۔؟ عازم الدین چونک کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔۔ عفریت آباد وادی سے ایک آواز آ رہی تھی ۔۔۔۔ شب کی مکمل خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک آواز ۔۔۔ ترنم اور موسیقی میں ڈوبی ہوئی ایک نسوانی آواز ۔۔۔۔ ایک ایسی آواز جو بالکل غیر متوقع اور بعید القیاس تھی ۔۔۔۔ عازم الدین کا دل بیٹھنے لگا اور اس کے ہاتھ رائفل کے دستہ پر شکنجہ کی طرح کس گئے ۔۔۔ پہلے اس نے سوچا کہ شاید یہ آواز اس کے تصور کا کوئی دھوکا ہو ۔۔۔۔ لیکن نہیں ایسا نہیں ہو سکتا تھا ۔۔۔ آواز ایک مرتبہ پھر فضا میں پھیل گیا ۔۔۔۔

وادی میں بالکل سناٹا تھا ۔۔۔ ہر طرف سکوت تھا ۔۔۔ چاند کی روشنی پھیکی پڑتی جا رہی تھی اور ہوا بھی خاموش ہو کر ٹھہر گئی تھی ۔۔۔۔

حرکت کیے بغیر وہ اپنی جگہ پر ایک ستون کی طرح موجود رہا۔۔۔ اسی طرح آدھا گھنٹہ گزر گیا۔۔۔ اور اب اس نے دیکھا کہ پروگرام کے بموجب حسن اصغر خیریت دریافت کرنے کے لیے اسکی طرف آ رہا ہے۔۔۔

"کہیئے عازم الدین صاحب۔۔۔ سب ٹھیک ہے نا۔۔۔" حسن اصغر نے کہا۔

"ہاں سوائے اس کے کہ ابھی ۴۵ منٹ قبل میں نے ایک عجیب آواز سنی تھی"

"کیسی آواز۔۔۔؟" حسن اصغر نے پوری دلچسپی سے دریافت کیا اور عازم الدین کے اتنے قریب آگیا کہ وہ اس کی آنکھوں کی غیر معمولی چمک دیکھ سکتا تھا۔

"ایک عورت کی ترنم میں ڈوبی ہوئی آواز۔۔۔" عازم الدین نے کہا۔

"اور یہ آواز کس طرف سے آئی تھی۔۔۔؟" حسن اصغر نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ ادھر بیگمات کے ان کھنڈروں کی طرف سے۔۔۔" عازم الدین نے انگلی سے اشارہ کیا۔

"کیا یہ آواز کسی جوان عورت کی معلوم ہوتی تھی۔۔۔"

"ہاں۔۔۔" عازم الدین نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

"خوب سمجھ کر جواب دیجیئے اس لیے کہ رات کے بہت سے پرندوں کی آواز بھی عورت کی آواز سے مشابہ ہوتی ہے۔۔۔ یا جب کوئی گیدڑ کسی

چھوٹے جانور کو پکڑتا ہے تو اسکی آواز پر بھی نسوانی آواز کا شبہ ہوتا ہے
۔۔۔۔" حسن اصغر مسلسل جرح کر رہا تھا۔

"یہ بات میں جانتا ہوں لیکن میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ
کہہ رہا ہوں کہ یہ آواز کسی جانور یا پرندے کی نہ تھی۔۔۔"

چند لمحات تک حسن اصغر بالکل سکوت کے ساتھ کھڑا رہا۔۔۔ اور اسکے
بعد عازم الدین کا ہاتھ پکڑ کر تیز قدموں کے ساتھ خیمہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

"مجھے کہاں لیے جا رہے ہو حسن اصغر۔۔۔ آخر یہاں پہرے پر کون
موجود رہے گا۔۔۔" عازم الدین نے احتجاجاً کہا۔۔۔۔

"ہمیں جلد از جلد سلیم کے خیمہ میں پہونچ جانا چاہیئے۔۔۔" حسن اصغر
گھبرا سا گیا تھا پندرہ منٹ کے اندر وہ دونوں سلیم کے خیمہ میں داخل ہو گئے
لیکن سلیم کا بستر خالی پڑا تھا۔۔۔۔

ایک عجیب عالم دیوانگی میں دونوں باہر نکلے تو انھوں نے دیکھا کہ سلیم
تھکے تھکے قدموں کے ساتھ دور وادی کی طرف سے آرہا ہے۔۔۔ عازم الدین
نے بیٹے کو آتے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔۔۔ لیکن حسن اصغر۔۔۔۔
وہ سمجھ چکا تھا کہ یہ آواز کس کی تھی اور سلیم کہاں سے آرہا ہے!!!

ب——۱۷

آج حتمی طور پر زلیخا کی بیداری کا دن تھا۔ — تمام کاموں سے فارغ
نے کے بعد تمام افراد مقبرہ میں تابوت کے پاس جمع ہو گئے، جیک کے
یہ پتھر کا ڈھکنا اٹھایا گیا۔ — ایک مرتبہ پھر سب کی نگاہوں کے سامنے
ڈی کا تابوت موجود تھا۔ —

"جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے بیداری کے سلسلے میں استعمال
نے والی تمام چیزیں یہاں موجود ہیں — اور میں ناشتہ کے وقت ہر ایک کو
تا چکا ہوں کہ کون آدمی کیا کام کریگا — مثلاً — آخری چراغ میں
ود روشن کروں گا —"

"اور میں آپ کے اشارے کا منتظر رہوں گا۔ — جیسے ہی آپ اشارہ
یں گے میں اس مادے میں، جو خوشبودان میں موجود ہے لوبان کی بتی ڈبو کر

اس کو جلا دوں گا۔" ڈاکٹر بیگ نے کہا۔

"اور میرا کام یہ ہے کہ جیسے ہی شہزادی آنکھیں کھولے میں اس قرابہ میں رکھے ہوئے شربت میں سلسلہ وار رکھا ہوا نمبر ۲ والا سفوف ڈال دوں گا اور تم یہ شربت اسکو پلا دوگے۔" عازم الدین نے کہا۔

"آخری ہدایت یہ کہ اس کو تابوت سے نکال کر جب ہم فرش پر لٹائیں گے اس وقت کوئی آواز نہ ہو۔ کوئی نہ بولے۔ بالکل قبر کا سا سکون رہے۔" حسن اصغر نے کہا۔

اس وقت مقبرہ کا اندرونی منظر واقعی عجیب و غریب تھا۔ ہزاروں سال پرانے شمع دان میں ایک انتہائی قدیم شمع جل رہی تھی۔ اور اسکا دھواں دائیں دروازے سے بل کھاتا ہوا باہر جا رہا تھا۔ پتھر کے تابوت میں انجیر کی لکڑی کا بنا ہوا کنول نما تابوت ذرا ترچھا رکھا ہوا تھا۔ تپائی پر دو پیالے رکھے ہوئے تھے جن میں کسی قسم کا مرہم تھا۔ ایک دھات کا بنا ہوا لوبان دان۔ ایک جواہرات سے مرصّع پیالی جس میں بھورے رنگ کا کوئی سفوف رکھا ہوا تھا۔ ایک صراحی۔ اور ایک بڑا چراغ۔ جو تپائی پر رکھے ہوئے ایک ایسے برتن میں رکھا ہوا تھا جس کے پائے کسی جانور کی ٹانگ کی شکل کے تھے۔ چھ اور چراغ کچھ کچھ فاصلہ پر رکھے ہوئے تھے۔

طرانی نے ہدایت کی تھی کہ جیسے ہی وہ شہزادی کو تابوت کے باہر نکالے لوبان جلا دیا جائے۔

اب طہرانی تابوت کے بالکل قریب چلا گیا۔۔۔ اس نے کہا۔ "قبل اسکے کہ میں ڈھکن کھولوں آپ لوگ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں کہہ لیں۔۔۔ یہ میری گزارش ہے کہ تابوت کھلنے کے بعد کسی کی زبان سے ایک حرف بھی نہ نکلے۔۔۔"

اور طہرانی کی اس آخری ہدایت کے تحت حسن اصغر نے سلیم کے کان میں کہا ۔۔۔ "شہزادی کی بیداری میں اب صرف چند ساعتوں کی دیر ہے ۔۔۔ میری التجا ہے کہ آج تم اپنے جذبات پر قابو رکھنا ۔۔۔ اور ایسی کوئی حرکت نہ کرنا جس کے نتیجہ میں نہ صرف یہ کہ کام خراب ہو بلکہ میں اپنی زندگی کے انتہائی قدیم مشن میں ناکام بھی ہو جاؤں ۔۔۔ اور ہاں ۔۔۔ میری وصیت پر بھی ضرور عمل کر لینا ۔۔"

سلیم نے حسن اصغر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔۔۔ صرف غور سے اسکی طرف دیکھتا رہا۔۔۔ دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ آج اسے کیا کرنا چاہیئے۔۔۔ تابوت پر جھکا ہوا طہرانی ایک نازک ہتھوڑی کی مدد سے ڈھکن کی کیلیں نکال رہا تھا۔۔ مقبرہ میں موجود ہر شخص کا سایہ رنگین دیوار اور خوبصورت چھت پر جم کے رہ گیا تھا۔۔۔ کسی انجانے خوف کے تحت عاذم کے چہرے کی سرخی غائب ہو چکی تھی، پروفیسر کی چوڑی پیشانی پر پسینہ کے قطرے نمودار تھے اور ڈاکٹر بیگ خاموشی کے ساتھ یہ سوچ رہا تھا کہ اگر واقعی تابوت کے اندر سے ایک زندہ عورت نکلی تو یہ علم طب کا ایک شاندار کارنامہ ہوگا۔۔۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ تابوت بالکل خالی ہو۔۔۔

مقبرہ کی تمازت ہر لمحہ بڑھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔۔۔

طرانی کا اشارہ پاکر حسن اصغر تابوت کے سرہانے گیا۔۔۔ دونوں۔ مل کر تابوت کا ڈھکن اٹھایا۔۔۔ اور پھر مقبرہ میں پھیلی ہوئی دھن روشنی میں سب نے دیکھا کہ زعفرانی رنگ کے کپڑوں میں لپٹی ہوئی ا ۔۔۔ جس کا چہرہ ایک سنہری نقاب میں پوشیدہ ہے تابوت کے ا سو رہی ہے۔۔۔۔

طرانی نے ایک مرتبہ پھر انگلی کے اشارے سے سب کو خاموش ر کا حکم دیا اور حسن اصغر کی مدد سے ذیفیقا کا ممیائی شدہ اکڑا ہوا جسم بڑ احتیاط کے ساتھ تابوت سے نکال کر زمین پر لٹا دیا۔۔۔

غازم الدین نے ایک گہری اور خوف زدہ سانس لی طرانی قینچی سے ز کے جسم پر کسی ہوئی پٹیاں[1] کاٹنے لگا اور ڈاکٹر بیگ نے خوشبو میں ڈ لوبان سلگا دیا۔۔۔ ہدایت کے بموجب سلیم نے بھی کانپتے ہوئے ہاتھو دو چراغ جلا دیے۔۔۔ اور چراغوں کے تیل کی خوشبو لوبان کی خوشبو مل کر کمرے میں پھیل گئی۔۔۔۔

ڈاکٹر بیگ نے جھک کر تابوت میں دیکھا۔۔۔ اور یہ دیکھ کر اس مزید حیرت ہوئی کہ اسمیں دستاویز نما کوئی اور چیز موجود ہے۔۔۔ ط کی اجازت لیے بغیر اس نے یہ چیز اٹھالی واقعی یہ ایک دستاویز تھی قدیم مصری زبان میں لکھی ہوئی ایک لمبی تحریر۔۔۔ طرانی کے کندھے

---

[1] جسم کی ممی بنانے کے بعد اسکو مصالحے سے بنے ہوئے کپڑے کی پٹیوں سے کس دیا جاتا

ہاتھ رکھ کر اس نے اس کو یہ دستاویز دکھائی اور طہرانی نے پٹیاں کاٹنے کا کام ادھورا چھوڑ کر اس کو پڑھنا شروع کر دیا۔

دستاویز میں لکھا تھا۔

"اے آنے والی نسل کے وہ انسان ۔۔۔ میں فرعون مصر توتمس سوم تجھ سے مخاطب ہوں ۔۔۔

ان فرعونوں کی ہدایت کے بموجب جو مجھ سے پہلے آچکے تھے میں نے بھی اپنی حکومت کے سولھویں برس "میسوری"[1] کے متبرک مہینے کے دسویں دن اپنے باپ دیوتا را کی تمام دعاؤں کے ساتھ اخناتون مصری کی اولاد زلیخا کا مقبرہ کھولا ۔۔۔ اور یہ دیکھ کر کہ زلیخا واقعی سو رہی ہے اور اس پر دیوی "ماٹما"[2] کا سایہ روز اول کی طرح باقی ہے ۔۔۔

اے وہ انسان ۔۔۔ جس کو میں نے کبھی نہیں دیکھا ہے میں ملکۂ ارض و سما حطشی پطا کا بھانجا اور فرعون زماں توتمس دوم کا بیٹا یہ اس لیے تحریر کر رہا ہے کہ جب تو شہزادی کو بیدار کرے تو اس سے یہ بھی بتا دے کہ توتمس سوم نے عقائد اور نسلی دشمنی کے باوجود محض اس کی اس محبت کی خاطر جو وہ احمس سے کرتی تھی اور اس جذبہ کی خاطر جس کا مظاہرہ اس نے سیتی اول کے تجربہ کی کامیابی کے لیے دکھایا تھا دیگر مقبروں کی طرح اس کے مقبرہ کو کوئی نقصان نہیں پہونچا دیا ۔۔۔ البتہ شاہی خزانے میں

---

[1] "میسوری" قدیم مصریوں کے ایک متبرک مہینہ کا نام تھا۔۔۔

[2] "ماٹما" زندگی کی دیوی سمجھی جاتی تھی۔۔۔

اسکا تمام سامان ضرور منتقل کر دیا تا کہ وہ میرے ان بیٹوں کے کام آئے جو مجھے نہ صرف فرعون بلکہ مقدس دیوتا ار کا بیٹا تسلیم کرتے ہوئے میرے آگے سجدہ کرتے تھے۔

زلیخا کا مقبرہ کھول کر اسکو بیدار کرنے والے اے انسان ۔۔۔ مجھے نہیں معلوم کہ تو کب اور کس وقت میری حکومت کے کتنے عرصہ کے بعد سیٹی اول کے اس تجربہ کی کامیابی کا اعلان کر دے گا ۔۔۔ لیکن میرے دیوتاؤں نے مجھے اتنا ضرور بتایا ہے کہ اس وقت بھی یہ دنیا آباد ہوگی ۔۔۔ اور نیل کا پانی اسی طرح مصر کو سیراب کر رہا ہوگا ۔۔۔ اسلیے میں اس دستاویز میں خود اپنی تاریخ نقش کروائے دے رہا ہوں تا کہ جہاں تو سیٹی اول اور اسکے مقدس کاہنوں کی عظمت کی داستان بیان کرے ۔۔۔ وہاں دنیا کو یہ بھی بتا کہ میں تومسس سوئم کون تھا ۔۔۔؟

ایک مرتبہ پھر یاد کرے کہ میں تومسس سوئم جس نے ہزاروں سال سے ایک ہی راستہ پر چلنے والے مصری تمدن کے ہر گوشے، علم و فن، رسم و رواج حتیٰ کہ مصریوں کے مخصوص خدوخال تک کا رخ اپنی مرضی کے مطابق موڑ دیا تھا ۔۔۔ اپنے خصوصی کاتب "آمخوطپ" سے یہ تحریر لکھوا رہا ہے ۔۔۔ اور گواہی کے لیے اپنے بیٹے "لوحردا" کو اپنے قریب بٹھا لیا ہے، ۔۔۔

سن ۔۔۔ اے زلیخا کو اسکی نیند سے نجات دلانے والے انسان سن ۔۔۔ کہ جب میرا باپ تومسس دوئم مرا تو میری عمر صرف نو برس کی تھی، میری پھوپھی حتشپ پورے مصر کے سیاہ و سفید کی مالک تھی ۔۔۔ وہ مجھے دربار میں

ہر وقت ساتھ رکھتی تھی اور اس نے میری کمسنی کے باوجود اپنی چھوٹی بیٹی "حطشپ سیط" کی شادی بھی میرے ساتھ کر دی تھی ۔

لیکن مجھے اپنی پھوپھی پر قطعی اعتبار نہ تھا۔ اٹھارہ برس کی عمر میں میں نے محل سے فرار اختیار کیا اور دس برس تک ایک مندر میں کاہن کی خدمت انجام دیتا رہا۔ اس کے بعد میں برسوں ان دور دراز دلدلی اضلاع میں چھپا پھرتا رہا جو حطشی کی دسترس سے دور تھے۔ جلاوطنی کے یہی وہ دن تھے جب میں نے آئین جہانبانی کے اسرار و رموز سیکھے۔ اور ایک دن تھیبز آ کر میں نے مصر کی ملکہ "حطشی پسط" یعنی اپنی پھوپھی کو سازش کے ذریعہ زہر دے کر مار ڈالا۔

مجھے پورا یقین ہے کہ میری پھوپھی ملکہ حطشی پسط مجھ سے ایک شفیق ماں کی طرح محبت کرتی تھی لیکن میں اس سے سخت متنفر تھا۔ اتنا کہ اکتیس سال کی عمر میں جب میں تخت پر بیٹھا تو میں نے حطشی کی تعمیر کردہ تمام عمارتوں سے ملکہ کا نام تک نکال ڈالا اور پھر انھیں مسمار کرا دیا۔

میں نے اپنے دورِ حکومت میں اپنے دشمنوں پر اٹھارہ حملے کیے۔ میں نے بتیس ہزار فوج کے ساتھ "فاد موتی"[ع۵] پر حملہ کیا اور صرف نو دن میں ایک سو ساٹھ میل چل کر "غازہ" پر قبضہ کیا۔ میں نے کدیشہ فتح کیا اور ۳۳۰ شہزادوں کو قتل کیا اور وہ دولت حاصل کی جو مجھ سے قبل کسی فرعون نے نہیں حاصل کی تھی۔

ع۵۔ فاد موتی ــــ اس علاقہ کو کہتے تھے جو آج فلسطین کہا جاتا ہے۔

میں نے ایسے جہاز بنائے جو سمندر کی سطح پر بطخوں کی طرح چلتے تھے اور ان کا انتظام اپنے ایک سردار "نب آمن" کو سونپ دیا جس نے میرے فوجی کمانڈر "آمن محب" کی مدد سے وہ تمام علاقے بھی فتح کر لیے جو سمندر کے اس پار تھے۔

اے زلیخا کے نجات دہندہ — تو اپنی دنیا کے عالموں اور فاضلوں کو بتا دے کہ میرے دشمنوں نے کبھی مجھ سے آنکھیں نہیں ملائیں اور جنگ میں ہمیشہ لومڑیوں کی طرح میرے مقابلہ پر بھاگ نکلے —

میں نے "اشوریہ"[۱] سے بھی خراج وصول کیا اور اپنی فوج کے ساتھ ایک ایسے ملک میں پہونچ گیا جہاں ہاتھیوں کی بے پناہ کثرت تھی، اس ملک میں میں نے ایک سو بیس ہاتھیوں کو شکار کیا۔ اور جب واپس آیا تو اپنے ساتھ تین لاکھ غلام بھی لایا جن کو دیکھ کر میری قوم کو بے انتہا مسرت ہوئی تھی۔

میں نے مصر کو خوشحال بنانے کے لیے، اپنے مفتوحہ ملکوں سے سونے اور چاندی کی صورت میں خراج وصول نہیں کیا بلکہ ان سے خوب صورت عورتیں، سنگ تراش اور فنکار مانگے، خراج بطور آئی ہوئی ان عورتوں سے میری قوم نے کر غنے، دو کھے، خشک اور بادعب مصری بچوں کے بجائے ملائم، نازک، چھوٹی تمیدہ ناک اور ہلکے تبسم والے بچے پیدا کئے تھے۔

اے اس تحریر کو پڑھنے والے انسان — میرے دشمن مجھے خونخوار،

---

[۱] اشوریہ — موجودہ عراق کا قدیم نام تھا۔

ظالم اور سنگدل کہتے تھے لیکن ان کا یہ الزام غلط تھا۔ میں انتہائی عفو پرور، رحمدل اور نیک فرعون تھا۔ ایک شریف لیکن بہادر دشمن کی طرح میں اپنے بدترین دشمنوں تک کو معاف کر دیتا تھا۔ میں نے کبھی بھی اپنے نفس سے محبت نہیں کی۔ اور اسکا زندہ ثبوت یہ ہے کہ جب میں نے زلیخا کا تابوت کھولا تو اسکا وہ چہرہ دیکھ کر جو دیوی عشتار سے مشابہ تھا میں اسیر عاشق ہوگیا۔ لیکن جب میں نے اپنے کاہنوں سے یہ سنا کہ زلیخا اپنے محبوب کے انتظار میں سیٹی اول کے کسی طبی تجربہ کے تحت سو رہی ہے تو میں نے اس کو بیدار کر کے اپنی ملکہ بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور تمام عمر اپنی واحد بیوی "حطشپ سط" پر ہی اکتفا کیا۔

اس لیے اے زلیخا کو جگانے والے نیک انسان۔ میں توتمس سوئم تجھ سے یہ چاہتا ہے کہ بیدار کرنے کے بعد تو بھی زلیخا کو کوئی تکلیف نہ دے اور ہر ممکن کوشش کر کے اس کو اس کے محبوب احمس سے ملا دے۔

میری طرف سے اسکا انعام یہ ہے کہ میں نے زلیخا کے تابوت کے بائیں طرف پانچ قدم چلنے کے بعد فرش سے تین ہاتھ نیچے سونے کے اتنے ٹکڑے دفن کر دیے ہیں جن کا بوجھ ایک تنہا آدمی نہیں اٹھا سکتا۔

زلیخا کو بیدار کر کے اس کو اس کے محبوب سے ملانے والے اے نیک دل انسان تجھ پر مصر کے تمام دیوتاؤں کی نوازش کی بارش ہو۔ یہ سونا میں تجھے اپنی طرف سے بخش رہا ہوں۔"

طرانی نے تحریر ختم کی۔ مسرت بھری نظروں سے عاذم الدین کی طرف

دیکھا گویا یہ کہہ رہا ہو کہ مہم کے اخراجات پورے ہونے کے علاوہ ایک ایسی رقم بھی ہاتھ آرہی ہے جس کا وہم وگمان بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔

وہ پھر زلیخا کے جسم سے ممیائی کی ہوئی پٹیاں کاٹ رہا تھا۔ سلیم نے دیکھا کہ پھٹی ہوئی پٹیوں کے درمیان شہزادی کے نازک اور ملیح شانے چراغ کی روشنی میں چاندی کی طرح چمک رہے تھے اور ان میں سے نکلتے ہوئے بازو ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے دو کھلے ہوئے کنول کے پھول۔۔۔۔ اب طہرانی نے آہستہ سے سنہری زرتار نقاب اس کے چہرے سے ہٹایا اور جیسے ہی سر سے دستار نما بندھے ہوئے رومال کو علیحدہ کیا۔۔۔۔ بل کھاتے ہوئے سنہرے بال اس کے چاند سے چہرے پر منتشر ہو گئے۔۔۔ سب نے غور سے دیکھا۔۔۔۔

نقاب کے نیچے ایک نرم و نازک سفید چہرہ تھا۔۔۔۔ خم کھائی ہوئی لمبی پلکیں بند تھیں، رخسار گلاب کی طرح سرخ تھے۔ ہونٹوں پر ایک بکھری ہوئی ایک نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ تھی۔۔۔۔ اور یہ ہی عورت کا سوتا ہوا جسم تھا جس کی تصویر عازم الدین کی لائبریری میں موجود تھی۔۔۔۔

کمرہ سکوت میں انتہائی ضبط کے باوجود ولیم کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی، چمکیلی اور عزم سے بھری ہوئی آنکھوں سے طہرانی نے سلیم کی طرف دیکھا، ہاتھ کے اشارے سے چپ رہنے کی تاکید کی اور پھر پروفیسر کی طرف دیکھا جس نے ڈر اور خوف کے تاثرات کے باوجود آخری دو چراغ بھی جلا دیئے۔۔۔۔

اب سلیم پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی زلیخا کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی بت

کی طرح خاموش حسن اصغر کی طرف ۔ اضطراب اور بے چینی کی لہریں اس کے پورے جسم میں دوڑ رہی تھیں، دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔ ابھی زلیخا زندہ ہو گی اور حسن اصغر ہم سب کے سامنے مر کر اس دنیا سے چلا جائیگا ۔ ـــــ ادھر سلیم اس الجھن میں تھا اور ادھر طرانی اس ضابطہ پر عمل کر رہا تھا جس کی تفصیل قدیم مصری دستاویز میں درج تھی ۔

تپائی پر رکھی ہوئی شیشی سے ایک سیال مادہ اپنے ہاتھوں میں انڈیل کر اس نے شہزادی کے جسم پر ملا ۔ پھر اسی تیل میں ایک کپڑا ڈبو کر اس کو جلتی ہوئی آگ میں ڈال دیا ۔ اور اسی خوشبو کے دھوئیں سے زلیخا کو دھونی دی ۔ اس آخری عمل کے بعد اس نے ساتواں اور آخری چراغ بھی روشن کر دیا ۔

زلیخا بیدار ہونے جا رہی تھی اور عازم الدین میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ ہزاروں سال سے سوتے ہوئے جسم کو ایک مرتبہ پھر زندگی کی بھرپور سانسیں لیتے ہوئے دیکھے، آنکھوں ہی آنکھوں میں اس نے طرانی سے باہر جانے کی اجازت مانگی ۔ اور ڈاکٹر بیگ کو ساتھ لیکر بلا آواز قدموں کے ساتھ مقبرہ کے باہر چلا گیا ۔

"ہوا ۔ مجھے ٹھنڈی ہوا کی سخت ضرورت ہے" باہر آتے ہی عازم الدین نے ڈاکٹر بیگ سے کہا جس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا ۔

"پانی پی لیجے خان بہادر صاحب ۔" ڈاکٹر بیگ نے یہ کہہ کر

ٹھنڈے پانی کی بوتل عازم الدین کے منہ میں لگا دی۔

عازم الدین نے ایک ہی سانس میں بوتل خالی کر دی، چند منٹ تک گہری گہری سانسیں لیں اور جب طبیعت کچھ سکون پر آئی تو ڈاکٹر سے انتہائی نحیف آواز میں کہا۔ "آپ چاہیں تو مجھے چھوڑ کر زلیخا کی بیداری کا ہوش ربا منظر دیکھنے جا سکتے ہیں۔"

"نہیں ۔۔۔ آپ کی طبیعت ٹھیک ہونے تک میں یہیں آپکے پاس موجود رہوں گا،" ڈاکٹر بیگ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"اب میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر ۔۔۔ لیکن خدا کی قسم زلیخا کو بیدار ہوتے دیکھ کر میرے بوڑھے دل کی حرکت ضرور بند ہو جاتی۔"

"آپ ہی کی نہیں ۔۔۔ ذہنی اعتبار سے خود میری حالت بھی دگرگوں ہو رہی ہے، آپ خود فیصلہ کیجئے کہ ساری عمر ایک خاص اعتقاد اور مخصوص نظریۂ حیات پر قائم رہنے کے بعد جب میں خود اپنی آنکھوں سے ان نظریات کی تردید ہوتے دیکھوں تو میرے دل و دماغ کی کیا کیفیت ہو گی نا۔ عازم الدین صاحب ۔۔۔ آج میں نے بہ نظر خود ایک ایسی چیز کا مشاہدہ کیا ہے جس نے میرے پیشے کے اس ڈھانچہ کو جس پر میری زندگی کا مدار ہے مسمار کر کے رکھ دیا ہے، وہ کیمیاوی اصول و تراکیب جن کو میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے بغیر کسی حجت کے مانتا چلا آیا ہوں بالکل باطل ثابت ہو رہی ہیں اور میں یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہو رہا ہوں کہ حیات انسانی کی نشوونما کے لیے ہمیں اسی بعید از فہم

علم مصری کے مطالعہ کی ضرورت ہے جس کی بنیاد پر شہزادی کے زندہ جسم کی ممی بنائی گئی تھی۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں ڈاکٹر — بہر حال آپ چاہیں تو مجھے چھوڑ کر اندر جا سکتے ہیں" عازم الدین کی آواز میں اب بھی کمزوری باقی تھی۔ "میں یہیں بیٹھ کر آپ سب کی کامیاب واپسی کا انتظار کروں گا۔"

"نہیں نہیں — میں یہیں رہونگا کامیابی کی اطلاع خود یہاں آجائیگی" ڈاکٹر بیگ نے عازم الدین کو ڈھارس دینے کے انداز میں کہا اور اسکے بعد دونوں خاموش ہو کر مقبرہ کے داخلی دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

ادھر سلیم، حسن صغرا اور دھرانی سوئی ہوئی زلیخا کو دیکھ رہے تھے — حسن صغر کے چہرے پر بے انتہا سنجیدگی چھائی ہوئی تھی اور دھرانی یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ زلیخا کی بیداری میں اب کیا کسر باقی رہ گئی ہے — مدھم روشنی میں زلیخا کا ساکت اور چھریرہ بدن ایک بت کی طرح زمین پر پڑا تھا — ہر لمحہ اسکی بیداری کی امید بھی اور ہر لمحہ ناامیدی — سلیم کی نظریں زلیخا کے دیدہ زیب چہرے پر جمی ہوئی تھیں — وہ یہ چہرہ مصر آنے سے قبل تغلق آباد کے کھنڈروں میں بھی دیکھ چکا تھا جبکہ یہ حسین پیکر اپنے مقبرہ کے تہ خانے میں ایک لا تعداد ہی مدت سے سویا ہوا تھا — اور اسی دن سے اسکا دل کہہ رہا تھا — زلیخا کو زندہ دیکھنے کے لئے مقدر ہو چکا تھا — کا دکناں قضا و قدر اس ملاقات کی لکیریں کھینچ چکے تھے — اور غالباً اسکی تخلیق کا مقصد بھی یہ تھا کہ زندہ ممی بننے کے

بعد محبت کی قربان گاہ پر زلیخا کی قربانی رائگاں نہ جائے۔ پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے خوابوں میں بسنے والی حور طلعت دوشیزہ سے نہ ملتا۔

سلیم نے غور سے زلیخا کی بند آنکھوں کی طرف دیکھا۔۔۔ نیلی آنکھیں بند تھیں، لمبی سیاہ پلکیں جھکی ہوئی تھیں، سنہری بال ہوا میں لہرا رہے تھے ۔۔۔ اور یہ کیا؟ شہزادی کے سینے میں اتار چڑھاؤ شروع ہو گیا ۔۔۔ زلیخا نے ہزاروں سال بعد نئی زندگی کی پہلی سانس لی ۔۔۔ اور پھر ایک خفیف سی آہ کے ساتھ مقبرہ کی خاموشی ٹوٹ گئی ۔۔۔

شہزادی زلیخا نے اپنی آنکھوں کے دلنواز پردوں کو دھیرے دھیرے کیف آفریں سکون سے اٹھایا، اپنے اوپر جھکے ہوئے چہروں کو چند لمحات تک تعجب سے دیکھا ۔۔۔ طہرانی نے لپک کر قرابہ میں رکھے ہوئے شربت میں سفوف ملا کر اس کے سوکھے لبوں سے لگا دیا ۔۔۔ اور بلا کسی توقف کے شہزادی نے اس کے چند گھونٹ پی لیے ۔۔۔

اور پھر کمرے میں ایک ایسی آواز ہوئی جیسے کوئی سوکھا ہوا درخت گر پڑے، جیسے کوئی آہنی ستون پلک جھپکنے میں منہدم ہو جائے ۔۔۔ جیسے کوئی پتھر لڑھک کر نشیب کی طرف چلا جائے ۔۔۔ سلیم، طہرانی اور پروفیسر نے اس غیر متوقع آواز کی طرف دیکھا اور اب ان کے منہ سے بھی ایک چیخ نکل گئی ۔۔۔

حسن اصغر کھڑے قد زمین پر گر چکا تھا ۔۔۔ تھکے ہوئے مسافر کو منزل پر پہنچتے ہی نیند آگئی تھی ۔۔۔ ایک ہزاروں سال بعد بیدار

ہوئی تھی اور دوسرا ہزاروں سال کی بیداری کے بعد نیند کی آغوش میں چلا گیا تھا۔

آواز مقبرہ کے باہر بھی پہونچی عازم الدین اور ڈاکٹر بیگ بھی دوڑ کر اندر آ گئے اور عزالی رقت آمیز آواز سے بولا۔ "زلیخا بیدار ہو کر زندگی کی سانسیں لے رہی ہے لیکن غالباً حسن اصغر اس ہوش ربا منظر کو دیکھتے دیکھتے بیہوش ہو گیا ہے۔ آپ ذرا اسکی خبر لیں۔ میں جلتے ہوئے چراغ بجھا دوں۔ تاکہ زلیخا اندھیرے میں اپنی پوری آنکھیں کھول سکے۔"

"نہیں۔ ڈاکٹر بیگ۔ حسن اصغر کو ہوش میں لانے کی ضرورت نہیں۔ اسکا وعدہ پورا ہوا۔ اور اب وہ مر چکا ہے۔" سلیم کی آواز اس بے پایاں مسرت کے باوجود جو اسے زلیخا کو بیدار ہوتے دیکھ کر ہو رہی تھی۔ غمزدہ نظروں سے اس نے کبھی زلیخا اور کبھی پتھرائے ہوئے حسن اصغر کی طرف دیکھا۔

زلیخا کی معصومانہ نظریں سلیم کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں اور حسن اصغر کی ساکت و جامد بے نور نظریں دور بہت دور خلا کی طرف دیکھ رہی تھیں جہاں اسکی روح پرواز کرتی ہوئی اپنے اسلاف سے ملنے جا رہی تھی۔

ہر ایک پر حسن اصغر کی اچانک موت ایک اسرار سی بنی ہوئی تھی لیکن سلیم جانتا تھا کہ آج حسن اصغر نہیں۔ گیتاری مرا ہے۔ وہ گیتاری جس کی طویل زندگی کا واحد مقصد زلیخا کی بیداری تھا۔ لیکن وہ

کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ لرزتے ہوئے آنسوؤں کی دو بوندیں اسکی آنکھوں میں جھلکیں اور اس نے حسن اصغر کے بے جان ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیکر کہا۔

۔۔۔" خدا حافظ دوست ۔۔۔ خدا حافظ ۔۔۔"

اور ان سب باتوں سے بالکل بے نیاز زلیخا اب بھی سلیم کی طرف تھکی تھکی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی ۔۔۔ دھیرے دھیرے نیلی آنکھیں طبعی نیند سے بوجھل ہونے لگیں ۔۔۔ اور چند لمحات کے بعد وہ پھر سو گئی۔

قدیم مصر کی تاریخ کے دونوں کردار سو چکے تھے لیکن ایک کی نیند زندگی سے بھرپور تھی اور دوسرے کی نیند موت سے بریز ۔۔۔

"شہزادی اپنی طبعی نیند سو رہی ہے اور غالباً ایک گھنٹے میں مکمل طور سے بیدار ہو جائے گی ۔۔۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ ہم حسن اصغر کی لاش لیکر باہر چلیں ۔۔۔" طرانی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

"نہیں آقائے طرانی ۔۔۔ مجھے حسن اصغر کی وصیت پر عمل کرنا ہے۔" سلیم نے روندھے ہوئے گلے سے کہا ۔۔۔

"کیسی وصیت ؟" طرانی اور علاؤ الدین دونوں نے ایک ساتھ پوچھا ۔۔۔

"اس کی وصیت تھی کہ اسے شہزادی کے تابوت میں ہی لٹا دیا جائے اور پتھر کا ڈھکن بند کر دیا جائے ۔۔۔ آج کے بعد یہ شہزادی زلیخا کا نہیں حسن اصغر کا مقبرہ ہے ۔۔۔"

"لیکن کیسے ۔۔۔؟" طرانی نے کہا۔

"یہ ایک لمبی داستان ہے جو میں یہاں نہیں بیان کر سکتا ۔ اس لیے میری بات کا یقین کیجئے اور قبل اس کے کہ زلیخا مکمل طور سے بیدار ہو مجھے حسن اصغر کی وصیت پر عمل کر لینے دیجئے ۔"

"تو کیا تمھیں اسکا پہلے سے علم تھا کہ حسن اصغر مر جائے گا ۔ ڈاکٹر نے پوچھا ۔

"ہاں ۔ ہم دونوں یہ بات جانتے تھے ۔ اور یہ رہا اسکا ثبوت ۔" یہ کہہ کر سلیم نے حسن اصغر کی مصری عبا الٹ دی ۔

عبا کے اندر حسن اصغر کفن پہنے ہوئے تھا ۔

"ہر ایک چیز اسرار ہے ، معمہ ہے ، سحر ہے ۔ خدا کی قسم میں پاگل ہو جاؤنگا ۔" ڈاکٹر بیگ نے آہستہ آہستہ کہا ۔ اور پھر سب نے مل کر حسن اصغر کی لاش زلیخا کے تابوت میں لٹا دی ۔ پتھر رکھنے کا آلہ ایک مرتبہ پھر حرکت میں آیا اور پھر سب کے دیکھتے ہی دیکھتے تابوت بند ہو گیا ۔

سنگی تابوت پر سلیم کی آنکھ سے آنسوؤں کی دو بوندیں ٹپکیں اور وہ کلیجہ پکڑ کر بیٹھ گیا ۔

—o—o—o—

باب ـــــــــــ ۱۸

کمرے میں ایک عجیب قسم کی نیم مردہ خاموشی طاری تھی۔

سنگی تابوت میں حسن اصغر کی لاش بند کی جا چکی تھی، سامنے زمین کے فرش پر زلیتھا اپنی طبعی نیند سو رہی تھی، ڈاکٹر بیگ اور پروفیسر ارشد پر سکتہ سا طاری تھا، بے پایاں تصورات کے اژدہام کی وجہ سے انکا دل و دماغ حسن اصغر کی اچانک موت اور زلیتھا کی طے شدہ بیداری کے اس زندہ معجزہ کو قبول کرنے کی صلاحیت کھو چکا تھا ـــــ عازم الدین گردن جھکائے بیٹھا تھا طہرانی کے چہرے پر سکون بھی تھا اور تفکر بھی اور سلیم ـــــ وہ اپنے دوست کے تابوت پر سر رکھے اب بھی آنسو بہا رہا تھا۔

ڈاکٹر بیگ کا کیمیاوی دماغ زلیتھا کو اپنی آنکھوں سے بیدار دیکھنے کے باوجود یہ سوچ رہا تھا کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟ ایک لڑکی فرعون سیتی اول کے

دور حکومت میں زندہ تھی، ایک لڑکی جو دوشیزگی کی عمر سے گذر چکی تھی ــــ اسکی زندہ ممی بنائی گئی، تاریخی حساب کے اعتبار سے اس کی عمر تین ہزار پانچ سو برس سے زائد تھی لیکن نہ ــــ اس وقت بھی اسکی عمر بیس برس سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی ــــ ماضی اور حال کی اس طویل مدت نے اس کے چہرے کی شگفتگی پر جسم کے نکھار پر ــــ آنکھوں کی چمک پر ــــ رخساروں کی تابندگی پر اور لبوں کی تازگی پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا ــــ

ڈاکٹر بیگ نے سوچا ــــ آخر ــــ وہ کون سے نامعلوم کیمیاوی اصول تھے جس نے اس طبی معجزہ کی تخلیق کی ــــ اس کا مطلب یہ ہے کہ طب اور سائنس کی آج تک کی جد و جہد بالکل بے معنی ہے ــــ وہ کتابیں جو اس مضمون پر لکھی گئی تھیں حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے قابل ہیں ــــ وہ تمام تجربہ جو حیات انسانی پر آج تک مختلف دور کے حکماء نے کئے تھے وہ سب غلط تھے ۔ اور صحیح تھا توسیٹی اول کا طبی مشیر ۔ یا ہیکل را کا کاہن اعظم ــــ جس نے ہزاروں سال گذرنے کے بعد بھی زلیتھا کی روح اور اس کے جسم دونوں کو باقی رکھا اچانک ایک سوال اس کے ذہن میں ابھرا ــــ کیا شہزادی زلیتھا غیر طبی عناصر سے تو نہیں بنی ہے ــــ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ایک سحر ہو" اور یہ سوچتے ہی ڈاکٹر بیگ کے جسم میں ایک جھرجھری سی آگئی ۔

لیکن بہر حال یہ سب پراگندہ خیالات تھے جو اس کے ذہن میں بار بار کلبلا رہے تھے اور وہ کسی صحیح نتیجہ پر نہیں پہنچ پا رہا تھا ۔

ڈاکٹر بیگ مادہ پرست تھا ۔ اس کا یقین تھا کہ دنیا میں صرف مادہ

ہے اور ایک ایسی قوت کا نام ہے جو انسان تو انسان نباتات و جمادات تک میں موجود ہے مغربی تعلیم نے اس کے ذہن کو روحانیت سے قطعی دور کر دیا تھا۔ ورنہ اس وقت جبکہ اس نے اپنی آنکھوں سے زلیتھا کو ہزاروں برس کی نیند سے بیدار ہوتے دیکھا تھا اسے کوئی تعجب نہ ہوتا اور اس ناقابل یقین بیداری کو بھی قدرت خداوندی کا ایک مظہر کہتا۔

ڈاکٹر بیگ اگر مادہ پرست نہ ہوتا تو اسے معلوم ہوتا کہ انسان علم و کمال کے انتہائی درجہ پر پہنچنے کے باوجود اپنی حقیقت سے نا آشنا ہے۔ وہ سب کچھ دیکھتا ہے لیکن خود کو نہیں دیکھتا۔ اس نے اپنی استعداد داخلی کو غفلت کا زہر پلا کر مردہ کر رکھا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی تمام تر خوابیدہ قوتیں بیدار ہونے کے بجائے اس کے لئے حجاب بن کر رہ گئیں اور وہ جو ماضی حال مستقبل سب کچھ جان سکتا تھا صرف امروز کے ہنگاموں میں اس طرح پھنس کر رہ گیا ہے کہ اس کی نگاہ بصیرت تک تاریکی میں ڈوب گئی۔ لیکن تابوت میں موت کی ابدی نیند سونے والے حسن اصغر کو یہ راز معلوم تھا، وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس پوری کائنات میں تغیر و تبدل کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ قائم ہے، یہاں کی کوئی شے ایک حالت اور ایک صورت میں نہیں قائم رہ سکتی۔ ہر بقا کو فنا ہے، ہر ذی روح کی تخلیق کا ایک مقصد ہے، اور ہر قلب میں ایک ایسا جوہر ودیعت ہو چکا ہے کہ اگر اسے بیدار کر لیا جائے تو فنا و بقا، عدم و وجود۔ موت اور زندگی کا ہر حجاب اٹھ جائے۔

ڈاکٹر بیگ کو یہ راز نہیں معلوم تھا کہ ہر فنا میں بقا رہتی ہے، ہر موت میں

زندگی ہے ___ اور جب کوئی پچھلی صورت معدوم ہوتی ہے تو ارتقائی منزلیں طے کرنے کے بعد ایک نئی صورت ضرور پیدا ہوتی ہے ___ جدید سائنس کے نام پر روحانیت اور ربانیت کے اصولوں کو فراموش کردینے والے مادہ پرست انسانوں کی طرح زلیخا کی ناممکن بیداری پر حیرت زدہ ڈاکٹر بیگ بھی الہیات کا یہ پہلا درس بھول چکا تھا کہ اللہ نے ہر انسان کے دل میں اپنی ایک امانت ودیعت کی ہے ___ اور یہ امانت وہ جوہر لطیف ہے جس کا بار اٹھانے سے زمین آسمان حد یہ کہ پوری کائنات نے انکار کردیا تھا ___ جوہر لطیف ___ یعنی روح جس کا ہلکا سا عکس دنیا میں پائے جانے والے ہر مادہ کے ساتھ ضرور پایا جاتا ہے ___ جیسے پھول میں خوشبو، ستاروں میں نور، ہواؤں میں تموج ___ پانی میں روانی ___ جسم میں حرکت ___ لیکن انسان کا جوہر لطیف ___ ایک ایسی روح ہے جس کی دسترس آسمان تک ہے۔ بلکہ آسمان سے بھی آگے ___ جو ازلی اور ابدی ہے، جو ایک بسیط جوہر واحد ہے اور جو کبھی فنا نہیں ہوسکتی ___

پھر اگر زلیخا کی روح بھی باقی رہی تو اس میں حیرت کی کیا وجہ تھی ___؟

ڈاکٹر بیگ اور پروفیسر ارشد دونوں کا انداز فکر ایک تھا ___ لیکن زلیخا کی بیداری کا منظر دیکھ کر وہ بھی غیر اعتقادی مسائل پر اعتقاد کرنے کے لئے مجبور ہوگئے ___ ورنہ حقیقتاً وہ پاگل ہوجاتے زندگی میں پہلی بار انھوں نے دل ہی دل میں روح کی لافانی عظمت کا اقرار کرلیا۔

اب زلیخا اپنی طبعی نیند کے دوران میں ایک زندہ انسان کی طرح

باقاعدہ سانسیں لے رہی تھی ___ اور کمرے میں ایک پراسرار خاموشی مسلط تھی۔

لیکن بہرحال یہ اکتا دینے والی خاموشی ٹوٹی اور طہرانی نے ڈاکٹر بیگ سے کہا۔

"ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ زلیتھا کے جسم کا معائنہ کرلیں ___ تاکہ اب بھی اگر کوئی کمی ہو تو اسے جدید طب کی روشنی میں پورا کرلیا جائے۔"

کانپتے ہوئے ہاتھوں اور کپکپاتی ہوئی نظروں سے ڈاکٹر نے زلیتھا کے جسم کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ "حیرتناک ___ ربِ حقیقی کی قسم حیرتناک ___

ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے میری مستند رائے یہ ہے کہ زلیتھا کی نبض، اس کا تنفس اور حرارت جسمانی غرضکہ ہر چیز اعتدال پر ہے۔ اس کا گوشت قطعی طور پر صحت مند ہے دانت بالکل صحیح و سالم ہیں خون کی رفتار ایک تندرست انسان کی طرح اپنی صحیح رفتار پر ہے۔ اور سوائے اس کے کہ اس کے سینہ پر بائیں جانب زخم کا ایک چھوٹا سا نشان ہے اس کا جسم بھی بالکل مکمل اور صاف ہے ___"

"غالباً زخم کا یہ چھوٹا سا نشان اس عمل جراحی کی یادگار ہے جو فرعون کے حکماء نے اس کے جسم پر ایک مسلسل نیند سلانے کے لئے کیا تھا۔" طہرانی اپنی رائے دی۔

"یقیناً آپ کا خیال درست ہے ___" ڈاکٹر بیگ نے کہا ___ میں اس نتیجہ پر بھی پہنچا ہوں کہ زلیتھا اب صرف اس نیند میں ہے جو انتہائی تھکن کے بعد ہر انسان کو آجاتی ہے، وہ بالکل زندہ ہے طہرانی ___ حالانکہ میرے عقائد و تجربات کی روشنی میں اسے ہزاروں سال پہلے ہی مرجانا چاہیئے تھا۔ جبکہ یہ حقیقت

ہے کہ آج اس کے متعلقین میں سے ایسا کوئی شخص نہیں ہے جو صدیوں پہلے فنا نہ ہو چکا ہو ــ"

اور ڈاکٹر جیگ کی زبان سے یہ بات سنتے ہی سلیم کا دل چاہا کہ وہ اسوقت سب کو بتادے کہ زلیخا کے متعلقین میں سے آخری فرد ابھی زندہ ہے اور وہ وہی ہے جس کی خاطر اس نے سیٹی اوّل کے تجربہ کے لئے خود کو پیش کر دیا تھا۔ جس کی زندگی صدیاں گذرنے کے باوجود ختم نہ ہوئی ــ صرف داستان کا ایک باب ختم ہوا دوسرا باب شروع ہوتا رہا ــ لیکن سلیم چونکہ غم اور خوشی کے ملے جلے جذبات کے تحت کسی بحث کے لئے تیار نہ تھا اس لئے وہ سب کچھ کہنے کی خواہش رکھتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ سکا۔

دراصل وہ خود ایک شدید الجھن میں تھا۔

اُسے اپنا گمشدہ ماضی یاد آرہا تھا ــ وہ رشح پرور لمحات یاد آرہے تھے جب زلیخا نے جبکہ وہ جنگ پہ جارہا تھا اپنی نیلی آنکھوں کی گھنی پلکوں کو آہستہ آہستہ اٹھا کے اپنی محبت میں سرشار نظروں سے آخری بار دیکھا تھا اور کہا تھا ــ "احمس ــ میں تمہاری واپسی کا انتظار کرونگی ــ لافانی دنیا تک۔ قیامت تک ــ اپنی زندگی کی آخری سانس تک ــ"

سلیم نے سوچا ــ "آج سے چند ماہ پہلے تک اسے کچھ بھی نہ معلوم تھا! نہ اپنے بارے میں ــ زلیخا کی مسلسل نیند کے بارے میں اور نہ اپنے دوست گیتاری کے بارے میں ــ لیکن سرزمین مصر پر قدم رکھتے ہی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس مٹی کی خوشبو وہ پہلے بھی سونگھ چکا ہے۔ ایسا کیوں ہوا۔ یہ زندگی

نے اتنا طویل سفر کیسے طے کر لیا —؟

سلیم کی الجھنیں اور بڑھتیں — لیکن اس نے دیکھا کہ زلیتھا نے ایک گہری سانس کے ساتھ بالکل اس انداز سے کروٹ بدلی جیسے وہ اٹھنے کے لئے تیار ہو رہی ہو — اس کی تمام تر توجہ زلیتھا کی طرف مبذول ہو گئی اور پھر سب کے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک تو پرسکون انگڑائی لی اور اٹھ کر بیٹھ گئی —"

سب تو سب — خود طہرانی بھی یہ منظر دیکھ کر ڈر گیا —

وہ عورت جو ہزاروں سال سے ایک بند تابوت میں محبوس تھی — وہ عورت جس کے جسم کو ایک ناقابل تصور عمل جراحی کے ذریعہ زندہ ممی میں تبدیل کر دیا گیا تھا — وہ عورت جس نے صدیوں سے نہ آفتاب کی روشنی دیکھی تھی اور نہ تاروں کی چمک — اور وہ عورت جس کو ابھی دو گھنٹے قبل ان سب نے موت سے ملتی جلتی نیند میں ڈوبے دیکھا تھا — ان کے سامنے زندگی اور جوانی کی بھرپور انگڑائی لے کر حیرت زدہ نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اے قاہرہ کے عجائب گھر کی زینت بڑھانے والی سیتی اول کی لاش۔ تیرا تجربہ کامیاب رہا — تو نے ہزاروں سال قبل جو خواب دیکھا تھا اس کی تعبیر مل گئی — تیرے حکیم اپنے علم و فن کی بنیاد پر طب کی دنیا میں جو انقلاب لانا چاہتے تھے وہ آگیا — تو مہذب اور سائنس پرست دنیا پر قدیم دنیا کی ترقی و کامرانی کا جو پرچم لہرانا چاہتا تھا وہ بہرحال سربلند ہو گیا۔

اب زلیتھا کی حیران نظریں سلیم کی طرف گھومیں — ایک کنواری اور

شبنم سے دھلی ہوئی معطر مسکراہٹ اسکے لبوں پر پھیلی ۔۔۔ رخساروں پر ڈوبتے آفتاب کی کرنوں نے والہانہ رقص کیا اور مقبرہ کے کمرے میں زلیتھا کے لبوں سے نکلنے والی پہلی نغماتی آواز گونجی ۔۔ "احسن ۔۔۔ دیکھو میں جاگ گئی ۔"

اور عازم الدین کو یاد آگیا ۔۔۔ یہ نغماتی اور ترنم میں ڈوبی ہوئی آواز وہ کل رات کو بھی سُن چکا تھا ۔۔ بالکل ایسی ہی آواز ۔۔۔ جو وادی بیگمات فرعون کی طرف سے آرہی تھی ۔

"کیتھاری کہاں ہے ۔۔؟" کمرے میں ایک مرتبہ پھر ترنم بکھر گیا ۔۔

"تھک کر گہری نیند سو رہا ہے زلیتھا ۔۔" سلیم نے جواب دیا ۔

"مجھے سخت گرمی لگ رہی احسن ۔۔ آؤ باہر چلیں ۔۔" اور ایک متحرک مجسمہ کی طرح اپنے مرمریں ہاتھوں کی مخروطی انگلیوں میں سلیم کی انگلیاں پھنسا زلیتھا اس طرح مقبرہ کے مختلف دروازوں سے ہوتی ہوئی باہر نکل گئی جیسے وہ ان تمام راستوں سے بخوبی واقف تھی ۔

"کیا میں یقین رکھوں کہ سلیم کی جان محفوظ رہے گی ۔۔" عازم الدین نے گھبرا کے طہرانی سے پوچھا ۔

"سلیم نہ کہو عازم الدین احسن کہو ۔۔۔ اور یاد رکھو کہ آج کے بعد وہ تمہارا بیٹا نہیں زلیتھا کا بچھڑا ہوا محبوب ہے ۔" طہرانی نے فوراً جواب دیا ۔

"لیکن اس وقت وہ گئے کہاں ہیں ۔۔؟" عازم الدین کے لہجے میں بدستور ایک ایسی پریشانی مضمر تھی جو صرف ایک باپ ہی اپنے بیٹے کے لئے محسوس کر سکتا ہے ۔

"وہ کہیں بھی گئے ہوں لیکن مجھے پورا یقین ہے کہ وہ شام تک خیمہ میں ضرور واپس آجائیں گے ۔۔۔ اس لئے آؤ ہم بھی باہر چلیں ۔۔۔ ہمیں شہزادی کے لئے ایک علیحدہ خیمہ کا بھی بندوبست کرنا ہے" طہرانی نے کہا ۔۔

"صرف ایک سوال طہرانی ۔۔۔ اور اس کے بعد میں دہلی کی واپسی تک بالکل خاموش رہوں گا ۔" ڈاکٹر بیگ نے طہرانی کے کندھے پر ہاتھ رکھکر کہا ۔ "حسن اصغر کی موت اور زلیخا کی بیداری میں کونسا رشتہ تھا ۔"

" خدا کی قسم میں کچھ نہیں جانتا ۔۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ حسن اصغر کا وجود ایک معمہ ضرور تھا ایک ایسا معمہ جسے سلجھانا ہماری فہم وادراک سے بالاتر ہے حسن اصغر کیا تھا ۔۔؟ کون تھا ۔۔؟ اور اس نے آج صبح سے ہی کفن کیوں پہن رکھا تھا ۔۔؟ یہ ایسے سوال ہیں جن کا جواب کم از کم میرے پاس نہیں ہے ۔۔" طہرانی ۔۔ رک رک کر کہا ۔

"تو کیا حسن اصغر کا وجود ہم سب کے لئے ہمیشہ ایک معمہ رہے گا ۔" ڈاکٹر بیگ نے پوچھا ۔

"نہیں ۔۔ ہم سب یہاں سے اس کے خیمہ کی طرف جائیں گے شاید اس کے سامان میں ہمیں کوئی مطلب کی چیز مل جائے ۔۔" طہرانی نے جواب دیا اور حسن اصغر کے تابوت پر الوداعی نظریں ڈال کر باہر نکل آیا ۔۔"

سورج غروب ہونے میں ابھی کافی دیر تھی ۔۔۔ خلاف معمول آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے ، ہوا رقص کرتی ہوئی چل رہی تھی ۔۔ ماحول میں ایک ترنم سا بکھرا ہوا تھا ۔۔ اور مسرت میں ڈوبی ہوئی فضا

پکار پکار کر پارٹی کے ہر فرد کو خوشی اور مسکراہٹوں کی دعوت دے رہی تھی لیکن بے مثال کامیابی کے باوجود ــــ سب مضمحل تھے، اداس تھے، غمزدہ تھے اور ہر شخص کا دل اگر ایک طرف حسن اصغر کی اچانک موت پر حیران و پریشان تھا تو دوسری طرف ان کے اعصاب پر ایک انجان خوف بھی مسلط تھا ــــ سب کی آنکھیں ایک دوسرے سے سوال کر رہی تھیں ۔ اور بار بار دور دکھائیوں کی طرف دیکھ رہی تھیں جدھر زینتھا اور سلیم کے قدم اٹھے تھے ۔

تھکے تھکے قدموں کے ساتھ سب لوگ اپنی قیام گاہ تک آئے، پروفیسر اور عازم الدین تو اپنے خیموں کی طرف چلے گئے لیکن طہرانی کے اشارے پر ڈاکٹر اس کے ساتھ حسن اصغر کے خیمہ میں داخل ہو گیا ۔

خیمہ کا سامان اس طرح رکھا ہوا تھا جیسے حسن اصغر ابھی اٹھ کر کہیں باہر گیا ہو ــــ ہر چیز ترتیب سے رکھی ہوئی تھی، ہر شے میں ایک سلیقہ تھا ۔ طہرانی نے غور سے خیمہ کے تمام سامان پر ایک گہری نظر ڈالی اور پھر اس کی نظر اس میز پر ٹھہر گئی جو خیمہ کے ایک گوشے میں رکھی ہوئی تھی ــــ میز پر ایک کتاب کھلی ہوئی تھی ــــــ اور یہ کتاب اس طرح رکھی تھی جیسے حسن اصغر نے اس کو پڑھتے پڑھتے اچانک چھوڑ دیا ہو ــــ لیکن جب طہرانی نے نزدیک آکر اس کتاب کو اٹھایا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس نے کسی فوری جذبے کے زیر اثر ڈاکٹر جنگ سے کہا ــــ "ڈاکٹر ــــ تم نے مقبرہ میں مجھ سے اپنا آخری سوال کیا تھا ــــ تم حسن اصغر کا وجود جاننا چاہتے تھے ــــ تم چاہتے تھے تمہیں یہ راز معلوم ہو جائے کہ حسن اصغر کیوں مرا ــــ لو ــــ اس کتاب

میں تمہارے سوال کا مکمل جواب موجود ہے ۔۔ یہ کتاب نہیں حسن اصغر کی پوری سوانح حیات ہے جو وہ اپنی زندگی کے مختلف دور میں لکھتا رہا اور جس کا آخری باب اس نے آج صبح سورج کی پہلی کرن پھوٹنے سے قبل ختم کیا تھا ۔۔"

"یعنی ۔۔ یہ ایک قلمی کتاب ہے ۔۔" ڈاکٹر بیگ نے پوچھا۔

"ہاں ۔۔ اور چونکہ میرے خیال میں اس کا آخری باب ہی انتہائی دلچسپ ہوگا اس لئے میں وہی سب سے پہلے پڑھوں گا ۔۔ سنو ۔۔ اور پھر فیصلہ کرو کہ حسن اصغر کو ہم کیا سمجھتے تھے لیکن درحقیقت وہ کیا تھا ۔۔؟"

اب طہرانی نے اس قلمی کتاب کا آخری باب پڑھنا شروع کیا۔

"میرا وجود ایک کڑی ہے جو حال اور ماضی کو ملاتی ہے ۔۔ ایک ایسا چراغ ہے جس پر تاریکی قبضہ نہیں کر سکتی، ہوا کے جھونکے نہیں بجھا سکتے کیونکہ اس میں وفا کا تیل ڈالا گیا ہے اور اسے میری قوت ارادی نے روشن کیا ہے ۔۔ لیکن وقت آگیا ہے کہ میں خود ہی پھونک مار کر اس چراغ کو بجھا دوں ۔۔

میں نہیں چاہتا کہ زلیتھا کی بیداری کے بعد میری روح ایک بے آواز نغمہ بنکر رہ جائے ۔۔ میں اپنی روح کے اس طویل سفر کی داستان جو آج سے تقریباً ۲ ½ ہزار سال قبل شروع ہوئی تھی اس کاغذ پر نہیں لکھ سکتا ۔۔ کیونکہ مجھے خطرہ ہے کہ لوگ اس پر یقین نہیں کریں گے ۔۔"

میں یہ داستان کسی کو سنا بھی نہیں سکتا کیونکہ میرے اردگرد ایسا

کوئی انسان نہیں ہے جس کے پاس ظاہری بینائی کے علاوہ باطنی آنکھیں بھی ہوں ۔ اس لئے میری خاموشی ہی بہتر ہے ۔ سچائی بہرحال سچائی ہے ۔

میں سوچتا ہوں ۔ مجھے اس کا کیا حق حاصل ہے کہ میں قدرت کے سربستہ راز کھول کر اس مادہ پرست دنیا کے سامنے تماشہ بن جاؤں ۔

مجھے معلوم ہے کہ کوئی نہ کوئی انسان میرے جانے کے بعد اس کتاب کو پڑھے گا ۔ اس لئے میں اس پڑھنے والے کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں اس دنیا میں ہزاروں سال سے موجود تھا ۔ میری زندگی کا ایک سلسلہ جاری تھا لیکن جس طرح ہر بقا کو فنا ہے اسی طرح کل دوپہر ڈھلنے کے بعد میں بھی فنا ہو جاؤنگا اور میرے بعد میری زندگی کی داستان یا پھر میری یہ تحریر ہی باقی رہ جائے گی ۔

میں نے ہزاروں سال تک یہ دنیا اور اس دنیا کے گوشے گوشے میں بسنے والے انسانوں کو دیکھا ہے ۔ میں نے چین میں کنفیوشس کی تعلیم سنی ہے ۔ میں نے گوتم بدھ کو جہالت اور انسانی دکھوں کے خلاف تقریر کرتے دیکھا ہے ۔ میں نے عیسیٰ کو صلیب پر لٹکتے دیکھا ہے ۔ میں نے بابل کی شان و شوکت دیکھی ہے ۔ میں نے روم اکبریٰ کی عظمت کا مشاہدہ کیا ہے ۔ میں نے اسیریا کے روحانی پیشواؤں کا مباحثہ سنا ہے ۔ میں نے یونان کے فلاسفروں کے نصب العین کا مطالعہ کیا ہے ۔

الغرض میرا دماغ خیالات سے پر ہے ۔ میرا جسم بیحد پرانا ہو چکا ہے لیکن روح ابھی بالکل تر و تازہ ہے ۔ میں تھکتا جا رہا تھا ۔ پھر خیم

بیحد پرانا ہو چکا ہے لیکن روح ابھی بالکل تروتازہ ہے۔ میں تھکتا جارہا تھا۔ میں سوجانا چاہتا تھا لیکن زلیتھا کی بیداری کے بغیر یہ بالکل ممکن نہ تھا۔ اس لئے میں نے بیحد ریاضت کی ۔۔۔ اور ایسے راستے دریافت کئے جن کے ذریعہ میں زلیتھا کی روح تک پہنچ گیا۔۔۔

میں نے زلیتھا کی بیداری کے انتظامات کئے اور اللہ کے حکم سے جو اس دنیا کا خالق ہے اور جس کے بغیر ایک پتہ نہیں ہل سکتا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جس نے یہ کام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔۔

اب مجھے پورا یقین ہے کہ زلیتھا بیدار بھی ہو جائے گی اور اس کا محبوب بھی اسے مل جائے گا۔۔۔ مجھے اسپاتا کی طرف سے خطرہ تھا اور اب بھی ہے۔۔ لیکن میں کیا کروں کسی کو فنا کرنا میرے اختیار میں بھی نہیں ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ اسپاتا کی خبیث روح زلیتھا اور احمس کو کوئی نہ کوئی نقصان ضرور پہنچائے گی ۔ لیکن میں ان دونوں کی سلامتی اور زندگی کی دعا مانگنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا ۔ کیونکہ میرا سفر ختم ہو چکا ۔۔۔ اب مجھے اپنی موت کا استقبال کرنا ہے ۔ میری روح اور میرا تھکا ہوا جسم اب صرف اپنی موت کا منتظر ہے ۔۔۔

میں زندگی کی ان زنجیروں کو توڑ کر پھینک دینا چاہتا ہوں جن کی بندش اور بوجھ سے میں تھک چکا ہوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ موت کا فرشتہ مجھے اپنے دامن میں چھپانے اور پھر مجھے وہاں لے جائے جہاں میرے آباؤ اجداد کی روحیں موجود ہیں اور روز قیامت کا انتظار کر رہی ہیں ۔

میرا یقین کامل ہے کہ خدا سے عظیم تر کوئی مالک اور سلطان نہیں ہے۔ وہی ہر شے کا خالق ہے وہی سب کا مالک ہے۔ اسی سے سب کی ابتدا ہے اور اسی تک سب کی انتہا ہے۔ وہی سلطان السلاطین ہے اور وہی ملک الملوک اس کی عظمت سب سے بالاتر ہے اور وہی کُل اکابر سے اعظم و اکبر ہے۔

میں جانتا ہوں کہ میری روح کے اس طویل سفر پر دنیا بہت حیران ہوگی لیکن خدا کے حکم سے سب کچھ ممکن ہے۔ روح کے مسئلہ پر ہمیشہ سے ایک پردہ پڑا ہوا ہے، اس کی حقیقت کوئی بھی نہیں جان سکتا۔ روح کو جب حواس ظاہری سے محسوس نہیں کیا جا سکتا تو اس کی حقیقت و ماہیت کو بھی نہیں سمجھا سکتا۔

اور اسی لئے میں بھی چاہتا ہوں کہ میری اس طویل زندگی کا راز بھی ایک راز ہی رہے اور دنیا یہ نہ جان سکے کہ میری روح اتنے طویل عرصہ تک اپنے جسم میں کیسے رہی —؟

بہر حال —۔

اے اس دنیا کی رنگینی اور مسرت — الوداع

اے مصر کی شہزادی ...... الوداع

اے میرے دوست احمس ...... الوداع

قلمی کتاب کی آخری سطریں پڑھنے کے بعد طہرانی نے ڈاکٹر بیگ کی طرف دیکھا جو خیالات میں گم حسن اصغر کی یہ آخری تحریر سن رہا تھا۔ اور جس کے ذہن میں بار بار حسن اصغر کی تصویر ابھر رہی تھی معصوم اور پاکیزہ تصویر —،

صاف اور واضح تصویر ۔

"آؤ دوست چلیں ـــ یہ دنیا بہت بڑی ہے، اس کا گوشہ گوشہ اسرار سے بھرا ہوا ہے، قدم قدم پر پیچیدگیاں ہیں ـــ اور ایسے معمے ہیں جن کو ہمارا دماغ حل نہیں کر سکتا ـــ اب یہی دیکھو کہ زلیخا بیدار ہوتے ہی سلیم کو لیکر وادی کی طرف چلی گئی ـــ کیوں گئی، کس لئے گئی اور وہاں ابتک کیا کر رہی ہے ـــ ہمیں کچھ نہیں معلوم ـــ" طہرانی نے کہا۔

"لیکن سلیم کی جان کو تو کوئی خطرہ نہیں ہے ـــ" ڈاکٹر بیگ نے بےچین ہو کر پوچھا ـــ

"حسن اصغر کی آخری تحریر کے بموجب ان دونوں کی جان کو کوئی نہ کوئی خطرہ ضرور ہے ـــ لیکن ہم ان دونوں کی واپسی کا انتظار کرنے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں ـــ" طہرانی نے ٹھنڈی سانس لے کر یہ جملہ کہا اور پھر دونوں اپنے خیموں کی طرف چلے گئے ـــ

باب ـــــــ ۱۹

ادھر عازم الدین اور طہرانی اپنے اپنے خیموں میں سلیم اور زلیتھا کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے اور ادھر یہ دونوں عاشق و محبوب دور بہت دور وادیٔ بیگمات مصر میں ایک قدیم مندر کے کھنڈرات میں کھڑے ہو کر اس گفتگو کو مکمل کر رہے تھے جو فرعون مصر سیتی اوّل کے دور حکومت میں نا مکمل رہ گئی تھی ۔

زلیتھا باغ کے کسی تر و تازہ پھول کی طرح بالکل شگفتہ تھی اس کے لبوں پر ایک لافانی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں ایک ایسی محبت انگڑائیاں لے رہی تھیں جس پر دنیا جہاں کی محبتیں نچھاور کی جا سکتی تھیں ـــ دونوں اس کھنڈر کے بالکل وسط میں کھڑے تھے ـــ

زلیتھا نے نغمگیں آواز سے سلیم کو مخاطب کیا ــــ "کتنے طویل انتظار کے
بعد تم مجھے ملے احمس ــــ افناتون کی مقدس روح کی قسم ــــ انتظار اپنی آخری
حدیں بھی پار کرتا جا رہا تھا ــــ"

اور سلیم نے کہا: "زلیتھا ــــ میں نہیں جانتا ایسا کیوں ہوا لیکن
ضرور جانتا ہوں کہ تمہارے بارے میں کچھ نہ جانتے ہوئے بھی جب پہلی بار میں
نے تمہاری تصویر کو اپنی لائبریری کے کمرے میں دیکھا تو مجھے ایسا ضرور محسوس ہوا
کہ میں ــــ"

"میں سب جانتی ہوں ــــ اس لئے ماضی کی بات کرنے کے بجائے اب
ہم اپنے مستقبل پر بات کریں، اپنی نئی زندگی کا منصوبہ بنائیں، اور یہ فیصلہ
کریں کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے ــــ تم جانتے ہو احمس ــــ اس وقت ہم کہاں
کھڑے ہیں ــــ" زلیتھا نے سلیم کی بات کاٹ کر کہا۔

"ہاں ــــ ہم توتمس سوئم کے بنائے ہوئے ایک عظیم الشان مندر کے
کھنڈروں میں کھڑے ہیں ــــ" سلیم نے مسکرا کر کہا۔

"یہ وہ مندر ہے جو توتمس سوئم نے نہیں ــــ مصر کی پہلی ملکہ حطشسی نے
بنوایا تھا ــــ اس کی لمبائی آٹھ سو فٹ تھی، دروازے پیتل اور چاندی کے
تھے ــــ پوری عمارت سنگ سرخ کے چار مہیب ستونوں پر کھڑی رہتی تھی ۔
اور اس کے دروازے پر دیوتا راء کے یہ الفاظ کندہ تھے ــــ "یہ ہے میری
بیٹی حطشسی پسھد کا بنوایا ہوا مندر ــــ جو میری طرف سے مصر کے درخشاں تخت
پر جلوہ افروز ہے ــــ جو پوری دنیا کی رہنما ہے جسکے حکم کی بجا آوری ہم

انسان پر فرض ہے، جس کی اطاعت اور تعظیم کرنے والا زندہ رہے گا اور جس کی نافرمانی کرنے والا لقمۂ اجل ہو جائے گا۔"

"لیکن تم یہ سب کیوں کہہ رہی ہو۔" سلیم نے جذباتی انداز میں کہا۔

"اس لئے کہ میں اسی مقدس مندر کے کھنڈر میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی وہ حسرت پوری کرنا چاہتی ہوں جو ہزاروں سال سے میرے سینے میں تڑپتی رہی اور جس کو دنیا کی کوئی مادی قوت مجھ سے نہ چھین سکی۔ الحمس۔ میں دیوی عشتار کی طرح تم سے کہتی ہوں۔ اے میرے محبوب۔ آ۔ اور میرا شوہر بن کر مجھے اپنی دلہن بنائے میں تجھے مال دنیا میں سے کچھ نہیں دے سکتی لیکن میں تجھے اپنی لافانی محبت دے سکتی ہوں۔ اپنے جسم کی خوشبو دے سکتی ہوں، اپنے رخساروں کا نکھار دے سکتی ہوں اور اپنی زندگی کا وہ آب حیات دے سکتی ہوں جس سے اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر انسان کی تخلیق ہوتی ہے۔"

"لیکن زلیبتھا۔ یہ شادی تو میرے والد کی موجودگی میں ہونا چاہیئے

ﷺ دیوی عشتار۔ مصر، بابل، اور یونان کی سب سے مقدس دیوی تھی۔، قدیم داستانوں کے بموجب بیحد عاشق مزاج تھی اور ایک مرتبہ بابل کے مشہور سورما جلج موس پر عاشق ہو گئی تھی۔، اور از خود اس سے شادی کی درخواست کی۔ اجلج موس نے یہ شادی تو کرلی لیکن چونکہ دیوی عشتار کا مسکن آسمان تھا اس لئے یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی۔

"نہیں اَمس — وہ شادی بعد میں بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ شادی مجھے اپنے دیوتاؤں کے سامنے کرنا ہے اور اس میں اس لئے تاخیر نہ ہونا چاہیئے کہ اسپاتا مجھے آج بھی اپنا منگیتر کہتا ہے" اسپاتا سے مت ڈرو زلیتھا! حسن اصغر اس کے جسم سے اس کی آنکھیں نکال کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اندھا کر چکا ہے —" سلیم نے یقین بھرے انداز میں کہا۔

"پھر بھی اَمس — ہمیں دیوتاؤں کے حضور میں اپنی شادی کر لینا چاہیئے۔"

اور پھر چند منٹ کے بعد زلیتھا سلیم کو لے کر ایک دیوا کے سامنے کھڑی ہوئی اس نے اپنے سر کے چند بال توڑے اور انھیں سلیم کے قدموں میں ڈال دیا — یہ گویا قدیم مصری رسم کے بموجب اس کا یہ اعلان تھا کہ اس وقت کے بعد وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سلیم کی ہو گئی — اس رسم کے بعد زلیتھا نے دلہن کا پرانا گیت اَمس کا ہاتھ اپنے ہاتھ لے کر گانا شروع کیا —

"میری زندگی کے مالک — اب میں تمہاری ہوں'
میری پوری زندگی تمہاری ہے، میرے جسم کا ہر
حصہ تمہارا اور صرف تمہارا ہے — آؤ — آج سے ہم
اپنے دیوتا کی فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، میرے محبوب
آؤ — ہم اس طرح ایک دوسرے میں پیوست
ہو جائیں جس طرح مقدس نیل کے پانی کی لہریں

ایک دوسرے میں ضم ہو کر رقص کرتی رہتی ہیں ۔ آج سے ہم مسرت کے گیت گانے کے لئے بالکل آزاد ہیں ۔ آج کے بعد ہم اپنی روح کو ہر لذت سے آسودہ کرنے کے لئے مختار ہیں ، اب ہم مخمور ہواؤں کے درمیان محبت کے نشے میں سرشار ہو کر گھوم سکتے ہیں او ۔ میرے سرتاج ۔ پھولوں کو ایک دوسرے کے پیار کرنے میں جو لذت حاصل ہوتی ہے ہم بھی اس کا تجربہ کریں ' ہم دونوں ایک دوسرے کو اپنے دل کی دھڑکنیں سنائیں اور اتنے قریب آجائیں کہ ہمیں موسم سرما میں بھی آگ کی ضرورت نہ رہے ، اے میرے محبوب ۔ اب مجھے رات کی تنہائیوں کا ڈر نہ رہے گا اور چاہے تاریکی اور نیند کا سمندر کتنا ہی گہرائیوں میں نہ ہو مجھے صبح کا کبھی انتظار نہ ہو گا ۔"

زلیتھا نے جو عالم تصور میں خود کو دلہن سمجھ رہی تھی انتہائی والہانہ انداز میں اپنی شادی کے اعلان کا یہ قدیم مصری گیت گایا اور اس کے بعد کہا "احمس ۔ جب تم شمالی جنگوں میں مصروف تھے اور میدان جنگ سے بری بری خبریں آرہی تھیں تو میں دیوتا

آمن کے حضور میں جھک کر گھنٹوں دعا مانگا کرتی تھی کہ اے میرے رب۔ احمس کو مجھ تک بخیریت پہنچا دے، میرے آنسو خشک ہوتے جا رہے ہیں، صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا ہے، اے میرے خالق ــــ تو احمس کو جنگ کے بدترین نتائج سے بچا، اسے موت سے محفوظ رکھ اور اُسے اس دشمن سے بچائے جو اس کے علاوہ تیرا بھی دشمن ہے ــــ لیکن دیوتا آمن را نے میری یہ دعا نہ سنی اور مجھے مجبورًا تمہارے انتظار میں ایک طویل مدت کے لئے سو جانا پڑا ــــ"

سلیم نے زلیتھا کی بات کے جواب میں کچھ نہ کہا بلکہ انتہائی جذبات کے ساتھ اس نے زلیتھا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور پھر ایک ایسی آواز کے ساتھ جس میں صرف خوشی ہی خوشی شامل تھی اس نے کہا "بہر حال تمہاری دعائیں قبول ہوئیں اور میں جو تمہاری دعاؤں کا مرکز تھا آج تمہارے سامنے موجود ہوں ــــ کیونکہ محبت ایک ایسی طاقت ہے جو موت کو شکست دیدیتی ہے ــــ میں آج تک تمہیں اپنا ایک تصوّر یا کوئی حسین خواب ہی سمجھتا تھا لیکن آج تم بھی ایک زندہ حقیقت کی طرح میرے سامنے موجود ہو اور موت کی وادی سے اس طرح بچ کر نکل آئی ہو جس طرح تیز دھوپ میں پتیوں کی آغوش میں چھپا ہوا کوئی پھول ــــ"

احمس اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا، وفورِ جذبات سے اس کا دل بھر آیا آنکھوں میں چھلکنے والے آنسو زلیتھا کو اس کے دل کا پیغام

سنانے لگے۔ اور پھر چند منٹ کے بعد دونوں دلوں نے اس یکجائی کو پالیا جو آج سے ہزاروں سال قبل زمانہ کے ظالم ہاتھوں نے ان سے چھین لی تھی۔

نہ معلوم کتنی دیر تک دونوں اسی طرح کھڑے رہے، حد یہ کہ سورج ڈھلنے لگا اور روشنی کم ہونے لگی۔ زلیتھا نے احمس سے کہا۔ "آؤ اب واپس چلیں، دن ختم ہوا، رات آرہی ہے۔ میری سہاگ رات۔"

"نہیں زلیتھا۔ دنیا کے موجودہ رسم و رواج کے تحت جب تک ہم دونوں کی شادی نہ ہو جائے ہماری سہاگ رات نہیں ہوگی۔"

"اور یہ شادی کب ہوگی۔" زلیتھا نے بےچین ہو کر کہا۔

"دہلی میں۔ جہاں تم نے سب سے پہلے مجھے اپنی جھلک دکھائی تھی۔"

"گویا اس طویل انتظار کے بعد جو میں کر چکی ہوں مجھے ایک اور انتظار کرنا پڑے گا۔" زلیتھا نے گہری سانس لیکر کہا۔

"ہاں۔ لیکن یہ انتظار پندرہ دن سے زیادہ مدت کا نہ ہوگا۔ ہم کل ہی یہاں سے قاہرہ روانہ ہو جائیں گے اور وہاں سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی۔"

لیکن سلیم کے اس اطمینان دلانے کے باوجود زلیتھا چپ سی ہوگئی، اس نے ایک مرتبہ افق مغرب کی طرف دیکھا۔ جہاں آفتاب دنیا پر الوداعی نظریں ڈال کر رات بھر کے لئے رخصت ہو رہا تھا، پھر مشرق کی طرف

دیکھا جہاں پھیکے چاند میں روشنی پیدا ہوتی جا رہی تھی، اور پھر دور وادی کی طرف دیکھا جہاں چٹانوں کے درمیان ایک چشمہ خاموشی اور سکون کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

زلیتھا کے چہرے کے ان تاثرات سے سلیم سمجھ گیا کہ وہ دہلی پہنچنے تک انتظار نہیں کرنا چاہتی چنانچہ اس نے اسے سمجھانے کے لئے کہا۔ "اداس نہ ہو زلیتھا۔۔۔ مسکراؤ۔۔۔ اس لئے کہ تمہاری مسکراہٹ ہم دونوں کے روشن مستقبل کی آئینہ دار ہے، تمہاری خوشی سے ہی ہمارے مستقبل کی خوشی وابستہ ہے۔۔۔ غم نہ کرو۔۔۔ مسکراؤ کیونکہ تمہاری اسی مسکراہٹ کی بنیاد پر مجھے زندگی کی لامتناہی مسرتوں کی عمارت بنانا ہے، مجھ پر بھروسہ کرو میری محبوبہ۔۔۔ تمہارے اس مقدس مندر میں ہماری شادی ہو چکی اور ہم دونوں روحانی اعتبار سے ایک دوسرے کے ہو گئے لیکن موجودہ تہذیب اور رسم و رواج کے تحت ہم دونوں کے لئے ساری دنیا کے سامنے شادی کرنا بھی بیحد ضروری ہے۔۔۔"

"تمہاری خاطر میں یہ انتظار بھی کر لوں گی۔۔۔" زلیتھا نے یہ جملہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن سلیم نے روشنی کم ہونے کے باوجود دیکھ لیا کہ شہزادی کی آنکھ میں آنسو امنڈ آئے ہیں، زلیتھا کی آواز میں کتنا درد تھا اور لہجے میں کتنی محبت تھی سلیم کو اس کا پوری شدت کے ساتھ اندازہ ہوا اور مزید تسکین دینے کے لئے اُس نے

زلیتھا کو گلے سے لگا لیا۔

"آؤ اب واپس چلیں ۔۔۔ ڈیڈی پریشان ہو رہے ہونگے ۔۔"

اور دونوں ہاتھ میں ہاتھ دے کر خیموں کی طرف واپس آگئے۔

جہاں طہرانی عازم الدین سے کہہ رہا تھا۔" خان بہادر صاحب ۔ وہ دونوں واپس آتے ہی ہونگے، مجھے ان دونوں پر نہیں ان کے عرفانی پیار پر بھروسہ ہے، ان کی پاکیزہ محبت پر اعتماد ہے ۔۔

اور اس قوت پر یقین ہے جس نے اس طویل مدت کی جدائی کے بعد بھی دونوں کو ملا دیا ۔۔۔"

شہزادی کے قیام کے لئے طہرانی نے تمام خیموں کے درمیان ایک بڑا گول خیمہ نصب کرا دیا تھا اور اس کو مصر کی پرانی وضع سے آراستہ بھی کر دیا تھا۔ تاکہ زلیتھا کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو ۔ طہرانی خوب جانتا تھا کہ شہزادی کا شاہانہ مزاج اس کی طویل نیند کے باوجود باقی ہو گا اس لئے اس نے تمام ساتھیوں کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ وہ زلیتھا سے انتہائی ادب و احترام کے ساتھ بات کریں ۔

ڈاکٹر بیگ نے یہ سوال بھی اٹھایا تھا کہ کیا زلیتھا قدیم مصری زبان میں گفتگو کرے گی یا کسی اور زبان میں جو سیتی اول کے دور میں رائج تھی۔ سوال اپنی جگہ بالکل درست تھا لیکن نہ معلوم کیوں طہرانی کو یقین تھا کہ شہزادی اردو میں ہی بات کرے گی اس لئے کہ یہ اس کے محبوب کی مادری زبان ہے اور روح کے لئے کسی زبان کا جاننا یا سمجھنا ضروری نہیں ۔"

غرض ۔۔۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور مصر کا سحر کار سماں فطرت کی گود میں لوریاں سننے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ زلیتیھا سلیم کے ساتھ خیموں کی قطار کے قریب پہنچ گئی ۔۔۔ طہرانی نے بڑھ کر مودبانہ انداز میں کہا "آپ کے قیام کا بندوبست وسطی خیمہ میں کیا گیا ہے شہزادی۔ ادھر تشریف لے چلیں ۔۔۔"

"مجھے خود امید تھی کہ میری واپسی تک آپ یہ انتظام کر چکے ہونگے"۔ شہزادی نے پُر وقار لہجے میں کہا اور سب ایک مرتبہ پھر حیرت زدہ ہو گئے۔ کسی کو یقین نہیں تھا کہ شہزادی اُردو میں بات کر سکے گی ۔

اس مرتبہ بھی فتح طہرانی کے خیال کی ہی ہوئی ۔۔۔

ڈر اور خوف کی ملی جُلی نظروں سے سب نے زلیتیھا کی طرف دیکھا۔ اور پھر سلیم کی طرف دیکھا جس کا چہرہ ہر قسم کی الجھن یا خوف سے بالکل مبرّا تھا۔ دونوں وسطی خیمہ تک گئے اور پردہ اٹھا کر زلیتیھا خیمہ میں داخل ہو گئی ۔۔۔

واپس آکر سلیم نے عازم الدین سے کہا "ڈیڈی ۔ حلشی لشیط کے قدیم مندر میں ہم دونوں قدیم رسم و رواج کے تحت ایک دوسرے سے شادی کر چکے ہیں ۔۔۔ لیکن یہ شادی اس وقت تک نامکمل ہے جب تک اسلامی طرز پر ہم دونوں کا نکاح نہ ہو جائے اس لئے کل ہی یہاں سے روانہ ہونے کی تیاری کیجئے ۔۔۔ ہم سب قاہرہ سے بذریعہ ہوائی جہاز دہلی واپس جائیں گے تاکہ اس کام میں مزید تاخیر نہ ہو ۔۔۔"

"اس لئے کہ زلیتھا کی زندگی کا ایک باب ختم ہو کر ایک بالکل نیا باب شروع ہو رہا ہے ۔" طہرانی نے گویا سلیم کی بات مکمل کر دی ۔

"کیسی بچوں کی سی باتیں کر رہے ہو سلیم ۔۔۔ ہم یہاں سے کل دن میں کیسے روانہ ہو سکتے ہیں جبکہ ہمیں تمام سامان باندھنا ہے اور پیدل چلنے کا انتظام کرنا ہے کیونکہ زلیتھا کے خوف سے تمام فرد ہمارا ساتھ چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں اور اپنا کام کرنے کے لئے ہم بالکل تنہا ہیں ۔" عازم الدین نے کہا اور منہ پھیر کر اس خیمہ کی طرف دیکھنے لگا جو خاص طور سے زلیتھا کے لئے نصب کیا گیا تھا اور جس میں سے اس وقت ہلکی ہلکی روشنی باہر آ رہی تھی ۔

"یہی نہیں ۔۔۔ ہمارے پاس زلیتھا کو مصر سے باہر لیجانے کا کوئی قانونی بند و بست بھی نہیں ہے ۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ مصری حکام ہمیں ایک ایسی لڑکی کو اپنے ساتھ باہر لے جانے کی اجازت دیدیں گے جو ہماری آمد پر ہمارے ساتھ نہیں تھی ۔۔۔" طہرانی نے کہا ۔ "مشکل یہ بھی ہے کہ ہم فوری طور پر زلیتھا کے لئے پاسپورٹ بھی نہیں بنوا سکتے ، ہم اپنا مشن مصری حکومت سے بالکل چھپا چکے ہیں ، ہم یہاں سیاح بطور آئے ہیں اور مان لیجئے ہم مصری حکومت سے یہ بتا بھی دیں کہ ہم نے ایک قدیم مقبرہ کھود کر زلیتھا کی زندہ ممی نکالی اور پھر ایک پرانی دستاویز کی مدد سے اس کو بیدار کیا ہے تو ہماری بات کا کون یقین کرے گا ۔۔۔" عازم الدین نے ایک ہی سانس میں جملہ مکمل کر دیا ۔

"اور اگر یقین کر بھی لیا تو زلیتھا ہماری نہیں مصر کے محکمۂ آثار قدیمہ

کی ملکیت سمجھی جائے گی ۔ اس کا پوری دنیا میں پروپگنڈہ ہوگا ۔ اور پھر حکومت مصر فرعون سیٹی اول کے دور کے اس زندہ مورخ کو کسی قیمت پر ہمارے حوالے نہیں کرے گی ۔" طہرانی نے ایک اور نکتہ نکالا۔ "کچھ بھی ہو ۔ ہمیں بہرحال یہ سوچنا ہے کہ ہم زلیتھا کو سرزمین مصر سے کس طرح باہر لے جائیں کہ کسی کو نہ کوئی شبہ ہو اور نہ کانوں کان خبر ہو ۔" سلیم نے فیصلہ کن انداز میں کہا ۔

"اور میری آخری رائے ہے کہ موجودہ حالات میں یہ بالکل ناممکن ہے۔" اب ڈاکٹر بیگ نے گفتگو میں مداخلت کی ۔

"مجھے بھی آپ کی رائے سے اتفاق ہے ۔" طہرانی نے کہا ۔ "ہمارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہم زلیتھا کا پاسپورٹ ہی نہیں بنوا سکتے ۔"

"لیکن کیوں ۔" سلیم نے بے چین ہو کر پوچھا ۔

"اس لئے کہ پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے ہمیں یہ بتانا پڑے گا کہ زلیتھا مصر کے کس قصبہ یا شہر کی رہنے والی ہے ، اس کی تاریخ پیدائش کیا ہے ، اس کے والد کا نام کیا ہے ، اس کی عمر کیا ہے ۔ اور ظاہر ہے کہ ہم زلیتھا کے بارے میں یہ کوئی تفصیل نہیں بتا سکتے ۔ کیونکہ اگر ہم سچ بولتے ہیں کہ زلیتھا آج سے ۳۱/۲ ہزار قبل مصر کے قدیم شہر تھیبز میں ایک شاہی خاندان میں پیدا ہوئی تھی اور آج تک زندہ ہے تو اوّل تو لوگ ہمیں پاگل سمجھیں گے اور دوم یہ کہ ہمیں حکومت مصر کی اجازت کے بغیر قدیم عمارتوں کی کھدائی کرنے کے الزام میں گرفتار بھی کر لیں گے اس لئے بہتر یہی ہے کہ ہم خوب سوچ

سمجھ کر اپنے اگلے اقدام کے بارے میں فیصلہ کریں ــ" طہرانی نے پوری سنجیدگی سے کہا ــ

"میں مانتا ہوں کہ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ حقائق پر مبنی ہے لیکن کچھ ایسی مجبوری ہے کہ میں زلیتھا کو اس وادی میں کل کے بعد نہیں رکھنا چاہتا ــ" سلیم کے اندازِ تخاطب میں التجا بھری ہوئی تھی ــ

"غالباً تمہارا اشارہ اسپاتا کی طرف ہے ــ" طہرانی نے اچانک کہا۔

"ہاں ــ لیکن آپ کو یہ نام کیسے معلوم ہوا ــ" سلیم کو اسپاتا کا نام طہرانی کی زبان سے سنکر انتہائی حیرت ہوئی ــ

"حسن اصغر کی اس آخری تحریر سے جو اس نے مرنے سے قبل لکھی تھی ــ" طہرانی نے جواب دیا ــ

"خیر ــ میرے خیال میں اب اس مسئلہ پر رات کے کھانے کے بعد تفصیلی بحث کی جائے گی، ہم اس گفتگو میں یہ بھی بھول گئے کہ ہزاروں برس کے بعد آج شہزادی زلیتھا زندگی کی بھرپور رعنائیاں لے رہی ہے اور ہمیں اس کے لئے کھانے کا بھی بندوبست کرنا ہے ــ" ڈاکٹر بیگ نے یہ کہکر گفتگو ختم کر دی ــ اور سلیم اپنے ذہن میں ایک نئی الجھن لئے ہوئے وہاں سے زلیتھا کے خیمہ کی طرف چلا گیا ــ

تمام مزدور بھاگ چکے تھے، ساتھ آیا ہوا عرب باورچی بھی ان مزدوروں کے ساتھ فرار ہو چکا تھا اس لئے کھانے کے انتظام میں بڑی دقت ہوئی ــ شہزادی کے خیمہ میں کھانا پہنچا دیا گیا اور پارٹی کے تمام

افراد نے جب کھانے سے فراغت حاصل کرلی تو ایک مرتبہ پھر زلیتھا کو بچانے کے مسئلہ پر بحث چھڑ گئی۔ گفتگو کے دوران میں اپنی رائے کو مزید تقویت دینے کے لئے سلیم نے اسپاتا کے بارے میں پوری کہانی بیان کردی اور یہاں تک کہدیا کہ اسپاتا کی خبیث روح سے نہ صرف زلیتھا کو بلکہ اُسے بھی خطرہ ہے کیونکہ اسپاتا بہر حال یہ نہیں چاہتا کہ زلیتھا کی شادی میرے ساتھ ہو۔

اور واقعی اسپاتا کی خبیث روح کے تصور سے ہر شخص کے رونگھٹے کھڑے ہو گئے سرزمین مصر آکر وہ ایسے سنگین حالات سے دوچار ہونگے یہ کسی کے تصور میں نہ تھا۔ سب سے زیادہ الجھن عازم الدین کو ہوئی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ مشن کی کامیاب تکمیل کے بعد یہ نیا خطرہ پیدا ہوگا۔

"بہر حال ہمیں حالات کا مقابلہ کرنا ہے" طرانی نے سب کو ڈھارس دی۔ "کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ واقعی سلیم کی رائے صحیح ہے۔ ہمیں ہر حال یہ مقام کل شام تک چھوڑ دینا چاہیئے۔ یہی نہیں شہزادی کی حفاظت کے لئے ہمیں تمام رات اس کے خیمہ کے چاروں طرف پہرہ بھی دینا چاہیئے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ ہم انسانوں کا تو مقابلہ کر سکتے ہیں لیکن روح کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔"

"میری تجویز ہے کہ ہم سب لکسر جا کر وہاں کے ہوٹل میں چند دن قیام کریں اور وہاں یہ سوچیں کہ زلیتھا کو مصر کے باہر کس طرح لے جایا

جائے۔" ڈاکٹر بیگ نے کہا۔

"آقائے طہرانی ــ تمام سامان یہیں چھوڑ دیا جائے، خیمہ اسی طرح نصب رہیں، ہم یہاں سے ناشتہ کے فوراً بعد لکسر کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔" عازم الدین نے رائے دی۔

"نہیں ــ ہمیں زلیتھا کے مقبرہ سے تونس سوئم کا دفن کیا ہوا سونا بھی نکالنا ہے کیونکہ تونس سوئم کی تحریر کے بموجب ہم اس کے مالک ہیں ــ" طہرانی نے بھولی ہوئی بات یاد دلائی۔

"مگر طہرانی ــ یہ سونا کہیں ہمارے لئے کوئی نئی مصیبت نہ کھڑی کر دے" عازم الدین نے جو دولت کی طرف سے بالکل لاپرواہ تھا اپنے دل کی بات کہدی۔

"کوئی مصیبت نہیں ــ ہم یہ سونا ضرور نکالیں گے ــ" طہرانی نے فیصلہ کیا۔ "سورج ڈھلنے سے قبل ہم مقبرہ سے یہ سونا نکال لیں گے اور فوراً لکسر کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔ لکسر پہنچکر ہم کسی مصری کو اس کے لئے رضامند کر لیں گے کہ وہ عارضی طور پر زلیتھا کا باپ بن جائے تاکہ ہمیں زلیتھا کا پاسپورٹ حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو اور اگر کوئی مصری اس کام پر رضامند نہ ہوا تو بہر حال سونا ہمارے پاس موجود ہوگا ہم سونے کی رشوت دے کر کسی غیر ملکی جہاز راں کمپنی کو راضی کر لیں گے کہ وہ زلیتھا کو غیر قانونی طور پر مصر سے باہر نکال کر اسے ہندوستان کے ساحل تک پہنچا دے ــ"

"بہت عمدہ تجویز ہے ۔۔۔ میرا خیال ہے کہ ہم میں سے کسی کو اس تجویز کے کسی پہلو پر اعتراض نہ ہوگا ۔۔۔" سلیم نے خوش ہو کر کہا ۔۔۔
اور پھر یہ تجویز منظور ہو گئی ۔۔۔

لیکن اسے کاش انھیں معلوم ہوتا کہ حالات کتنی سنگین صورت اختیار کر چکے ہیں اور نہ صرف یہ رات زلیتھا کے لئے کٹھن ہے بلکہ کل کی صبح بھی اس کے لئے کتنی زبردست مصیبت لانے والی ہے ۔

فیصلہ یہ بھی ہوا تھا کہ تمام رات زلیتھا کے خیمہ کے چاروں طرف پہرہ دیا جائے لیکن سلیم نے کہا کہ پہرہ دینے کے لئے صرف وہ کافی ہے ۔ سلیم کی یہ بات اس محبت اور شفقت کی بنیاد پر جو وہ سب سلیم سے رکھتے تھے رد ہو گئی ۔۔۔ طے یہ ہوا کہ دو دو گھنٹے ہر شخص پہرہ دے گا ۔۔۔ سب سے پہلے طہرانی کو پہرہ دینا تھا ، اور اس کے بعد سلیم کی باری تھی ۔

گفتگو کے خاتمہ پر سلیم زلیتھا سے ملنے کے لئے اس کے خیمہ میں گیا تو وہ اپنے بستر پر اس طرح سو رہی تھی جیسے کوئی نرم و نازک پھول تیز ہوا کے جھکڑ سہنے کے بعد ٹھنڈی ہوا کی ہلکی ہلکی لہروں کی لوریاں پا کر سو گیا ہو ۔۔۔ یا کسی ایسے مسافر کو جسے ایک عرصہ تک آرام کرنے کا موقع نہ ملا ہو اور وہ کسی گھنے درخت کی چھاؤں میں تھک کر سو گیا ہو ۔۔۔ دیر تک سلیم وقت کی اس سب سے خوبصورت عورت کو دیکھتا رہا جس کے چہرے پر حنا کے پھولوں کا شبہہ ہوتا تھا ، وہ اپنے بستر پر اس انداز سے لیٹی ہوئی تھی جیسے موم کی ایک نازک مورتی ۔۔۔ جس میں باغ کے تمام پھولوں

کا حُسن اور چاند کی ہر ممکن رعنائی سمٹ کر یکجا ہو گئی تھی ۔

سلیم ۔۔۔ زلیخا کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ رات ۔۔۔ زلیخا کی آغوش محبت میں بسر کرنے کی رات تھی ۔ جو اس طرح ذہنی الجھنوں میں بسر ہو گی لیکن اس کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا ۔ کہ وہ صبر کرے ، انتظار کرے اور اخلاق اور معاشرہ کی حدوں کو پار کئے بغیر زلیخا کو ہمیشہ کے لئے اپنا نہ بنائے ۔۔۔ "

اس نے چاہا کہ وہ زلیخا کو بیدار کر کے اس سے رات بھر کیلئے جدا رہنے کی اجازت حاصل کرے ۔ لیکن شہزادی کے ملکوتی حُسن کو دیکھکر اور ان رخساروں کو دیکھکر جس میں خیمہ کی کھڑکی سے دبے پاؤں آتی ہوئی چاندنی کی روپہلی کرنیں رقص کر رہی تھیں اس کی ہمت نہ پڑی ۔ اور اس نے سوچا ۔۔۔ " سلیم آج کی رات کے لئے یہی بہتر ہے کہ حسن سوتا رہے اور عشق اسکو دیکھتا رہے ۔"

شاہی انداز میں سجے سجائے اس خیمہ میں چاند اور چراغ کی ملی جلی روشنی پھیلی ہوئی تھی ، ۔ اور اس روشنی میں محوِ خواب زلیخا کا چہرہ اس طرح روشن تھا کہ اس کی لمبی پلکیں ، ستواں ناک ، سنہرے بال اور دہکتے ہوئے رخسار چودھویں رات کے چاند کی طرح نمایاں تھے ۔ سنہرے بالوں کی ایک بل کھائی ہوئی لٹ اس کی سفید اور چمکتی ہوئی پیشانی پر اس طرح کھیل رہی تھی کہ سلیم کے لئے یہ منظر دیکھ کر تاب ضبط نہ رہی ۔

سلیم نے بڑھ کر بالوں کی یہ لٹ چہرہ سے ہٹائی اور زلیتھا کی آنکھ کھل گئی، وہ نیلی آنکھیں جن میں دوشیزگی کی معصومیت پاکیزہ فرشتوں کی طرح جھانک رہی تھی، یہ آنکھیں سلیم کو دیکھکر چند لمحات کے لئے مسکرائیں لیکن پھر اچانک جیسے یہ مسکراہٹ نیلی آنکھوں کے اس خاموش سمندر میں ڈوب کر مرگئی ہے، اور لمبی لمبی سیاہ پلکوں کے نیچے حسرت و یاس کی گہری تاریکی چھاگئی ہے،

"تم نے مجھے کیوں جگایا احمس" ایک مدھم سا زخمہ میں بلند ہوا،

"تم سے رات بھر کی جدائی کی اجازت مانگنے کے لئے"

"مجھے سونے دیا ہوتا احمس — گذرے ہوئے واقعات ماضی کے دھندلکے میں ابھر ابھر کر ایک رنگین اور مدہوش کن خواب کی صورت میں میری نیند کو لوریاں سنا رہے تھے — ایک رات کے لئے جدائی کی اجازت مانگنے کا کیا سوال — احمس — تم تو گذشتہ ۳ ½ ہزار سال سے میرے ساتھ ہو — آج اور گذری ہوئی کل میں فرق صرف اتنا تھا کہ کل تک تمہارے بغیر میری زندگی ایک خواب پریشان تھی لیکن آج ایک رنگین کیف — لیکن اسے کاش تم مجھے نہ جگاتے —" زلیتھا نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"مجھ سے غلطی ہوئی زلیتھا —" سلیم نے جیسے معافی مانگی،

"نہ معلوم کیوں — تمہیں دیکھکر ایک نامعلوم سی آرزو میرے دل و دماغ کے کسی گوشے میں سلگنے لگتی ہے، ایک انجانی سی تمنا میرے

جسم کی ہر رگ میں انگڑائیاں لینے لگتی ہے اور احمس ۔۔۔ پھر میں بیقرار ہو جاتی ہوں ۔ میں سوچتی ہوں تنہائی کے راستے کتنے کٹھن ہوتے ہیں ۔۔ رب رار کی قسم ہزاروں سال تک میں صرف تمہاری یاد کے سہارے زندہ رہی ۔۔ غم کے ویرانوں میں بھٹکتی رہی ، محبت کی تیز آگ میں جلتی رہی لیکن اتنی بیچین کبھی نہیں ہوئی جتنی کہ آج شام سے ہوں ۔ احمس ۔۔۔ سچ بتاؤ میری یہ بیچینی کسی حادثہ کا پیش خیمہ تو نہیں ۔۔"

"نہیں زلیتھا ۔۔ آنے والی صبح مسرت کے کھلتے ہوئے پھولوں کے ساتھ ہمارا استقبال کرے گی ۔۔۔ ہم کل ہی یہاں سے لیکر روانہ ہو جائینگے۔"

"رب رار تمہیں اس ارادے میں کامیاب کرے ۔ لیکن سلیم اب تم بقیہ تمام رات کے لئے اس خیمہ سے باہر نہ جاؤ ۔۔۔ تم یہاں رہو گے تو مجھے رات پر بھی دن کا گمان ہو گا ۔۔" زلیتھا نے ہاتھ پھیلا کر کہا ۔

"میں ضرور رک جاتا زلیتھا ۔۔۔ لیکن آقائے طہرانی خیمہ کے باہر موجود ہیں اور تم نہیں سمجھتیں کہ میرا قیام میرے بزرگوں میں میرا کتنا مذموم فعل سمجھا جائے گا ۔۔۔"

"اچھا ۔۔۔ پھر جاؤ ، دیوتا آمن تمہاری حفاظت کریں ۔۔۔"

اور سلیم نے دیکھا کہ آنسوؤں کی دو ننھی سی بوندیں زلیتھا کی آنکھوں کے دونوں گوشوں میں کانپ گئیں ۔

سلیم نے چاہا کہ وہ بھی زلیتھا سے کہے کہ تم دور ہوتے ہوئے بھی تمام رات میرے بالکل قریب رہو گی ۔ اتنی قریب جیسے جلتی ہوئی شمع کے

نزدیک پروانے ۔۔۔ یا کسی پہاڑی جھیل کے سینے سے چمٹے ہوئے کنول ۔۔۔ تم کیسے یہ اندازہ کر رہی ہو کہ یہ خوابناک سماں ۔ ستاروں کی ٹمٹماتی ہوئی جھلکیاں ہَوا کے مست جھونکے اور تمہارے لبوں سے نکلتی ہوئی آواز کا یہ دھیما دھیما ترنم مجھے بیتاب نہیں کر رہا ہے ۔" لیکن خواہش اور ارادے کے باوجود وہ کچھ نہ کہہ سکا ۔

"خدا حافظ ۔" سلیم نے جذبات میں ڈوب کر زلیتھا سے کہا اور خیمہ کا پردہ گرا کر باہر چلا گیا ۔

رات قبر کی طرح سنسان اور کسی مرمریں مجسمے کی طرح خاموش تھی ۔ باہر آ کر سلیم نے ایک مرتبہ پھر خیمہ پر نظر ڈالی اور پھر اپنے خیمہ کیطرف چلا گیا ۔

طہرانی پہرے پر موجود تھا ۔

لیکن اسے کاش اسے معلوم ہوتا کہ سلیم کے باہر آتے ہی زلیتھا کے خیمہ میں ایک اور سایہ داخل ہو چکا ہے ۔ اور شہزادی بالکل تنہا ہے ۔

باب ــــــــ ۲۰

یہ سایہ تاریک تھا ۔ اس لئے کہ یہ اسپاتا کی روح تھی ۔

" شادی مبارک ہو زلیتھا ۔ "

" یہ آواز کہاں سے آئی ۔ کون مجھے مبارکباد دے رہا ہے ۔" زلیتھا ڈر سی گئی ۔

" اسپاتا ۔ جو آج بھی تمہیں اپنی منگیتر سمجھتا ہے ۔ "

" لیکن تم مجھے دکھائی کیوں نہیں دیتے ۔ " شہزادی اور زیادہ ڈر گئی ۔

" تمہارے دوست گیتاری نے زندگی کا آخری سفر اختیار کرنے سے قبل میرے جسم کی آنکھیں نکال لی ہیں زلیتھا ۔ اس لئے میں جسم کے بغیر یہاں موجود ہوں ۔ "

"اور تمہارے آنے کا مقصد ـــ"

"میں تم سے کچھ بات کرنے آیا ہوں ـــ"

"لیکن میں بات کرنا نہیں چاہتی ـــ میں نہیں چاہتی کہ گزشتہ تاریخ کے اوراق جمع ہو کر ایک مرتبہ پھر میری زندگی کو سوگوار کر دیں ـــ اسپاتا ـــ ایک عورت کی آرزوؤں کو سمجھنے کی کوشش کرو ـــ اور میری خوشیوں کو غم کے آنسوؤں میں تبدیل کرنے کی سعی نہ کرو ـــ"

"ڈرو مت زلیتھا ـــ میں تمہیں کوئی نقصان پہنچانے نہیں آیا ہوں ـــ حقیقت یہ ہے کہ میں تمہیں نقصان پہنچانے کی قدرت بھی نہیں رکھتا ـــ میں تم سے آخری اور صرف آخری بار ملنے آیا ہوں ـــ اور یہ بتانے آیا ہوں کہ تو تمس سوئم کے بنوائے ہوئے مقدس مندر میں احمس سے شادی رچانے والی زلیتھا یاد رکھے کہ شادی کے بعد بھی وہ احمس کی نہیں ہو سکتی ـــ"

"یہ تمہارا خیال ہے اسپاتا ـــ" اب زلیتھا بھی پُرسکون تھی ـــ

"خیال نہیں میری منگیتر ـــ ایک ایسی حقیقت ہے جسکو میں اسوقت بھی مستقبل کے پردوں پر لکھا ہوا دیکھ رہا ہوں ـــ میں ایک دلہن کی مسکراہٹوں کے نیچے آنسوؤں کا لہریں مارتا ہوا سمندر دیکھ رہا ہوں، میں ایک دولھا کے سہرے پر خزاں رسیدہ پھولوں کی لاش دیکھ رہا ہوں ـــ میں شادی کے ہنگاموں کو غمزدہ آہوں میں تبدیل ہوتے دیکھ رہا ہوں ـــ میں سچ کہتا ہوں کہ میں زندگی کے دل میں موت

کا کانٹا چبھتے دیکھ رہا ہوں ۔۔۔ زلیتیھا ۔۔۔ میں تمہاری بیوفائی اور سیٹی اول کی حکم عدولی پر تم سے کوئی انتقام لینے کے قابل نہیں رہا لیکن جس طرح میں کیتاری سے کہہ چکا ہوں اُسی طرح تم سے بھی کہتا ہوں کہ تم احمس کی نہیں ہو سکتیں ۔۔۔"

"تم خبیث ہو اسپاتا ۔۔۔، میں احمس کی اس وقت بھی تھی جب وہ شمالی جنگوں میں مصروف تھا، اس وقت بھی تھی جب سیٹی اول نے تم سے میری منگنی کا اعلان کیا تھا، اس وقت بھی تھی جب محض تمہارے ناپاک وجود سے خود کو دور رکھنے کے لئے میں نے زندہ ممی بننا منظور کیا تھا اور اس وقت بھی ہوں جبکہ تم اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ میرے اس خیمہ میں موجود ہوئے اسپاتا ۔۔۔ تم بھول رہے ہو کہ عورت مرد کے مقابلہ میں انتہائی مستقل مزاج، باوفا اور محبت کو آخری سانس تک نبھانے والی ہوتی ہے ۔۔۔"

"میں سب جانتا ہوں ۔۔۔" اسپاتا کی آواز میں بے بسی پیدا ہو گئی ہے ۔

"پھر تم دور جاتے ہوئے غموں کو میری زندگی میں دوبارہ کیوں داخل کرنا چاہتے ہو ۔۔۔ تم میری تلخیوں اور مایوسیوں کی واپسی کیوں چاہتے ہو ۔۔۔ تم میری محبت کی لافانی فتح کو شکست میں تبدیل کرنا کیوں چاہتے ہو۔ جس نے اپنی زندگی کے تاریک اور طویل راستے پر جو شمع جلا رکھی تھی اسکو تم کیوں بجھا دینا چاہتے ہو ۔۔۔ تم ایک خزاں کا جھونکا بن کر میری بہار کو

کیوں لوٹنا چاہتے ہو۔" زلیخا تقریباً چیخ پڑی۔

"میں کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ دیوتا راز کا عذاب تم پر از خود نازل ہوگا اور میں جانتا ہوں کہ یہ عذاب کیا ہوگا۔" اسپاتا کی آواز میں بدستور بے رحمی باقی تھی۔

"مجھے دھمکی نہ دو اسپاتا۔ اور نہ بددعا دینے کے لئے مقدس دیوتاؤں کا سہارا لو۔"

"میری منگیتر۔ میں نہ تمہیں کوئی بددعا دے رہا ہوں اور نہ دھمکی۔ میں تو صرف تمہاری تقدیر کی لکیریں پڑھ رہا ہوں کیونکہ میں روح ہوں اور روح سب کچھ جان سکتی ہے۔"

"تو مجھے بتاؤ کہ میری تقدیر میں کیا ہے۔"

"یہ بتا کر میں تمہاری کہانی یہیں اسی خیمہ میں ختم کروانا نہیں چاہتا اور میں اب رخصت بھی ہوتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ خلش تمہیں بھی اسی طرح تڑپاتی رہے جس طرح میں تڑپتا رہا ہوں میں پھر کہتا ہوں کہ تم احمس کی نہیں ہوسکتیں۔" خیمہ میں ایک بڑا ہی بھیانک قہقہہ بلند ہوا اور زلیخا نے اپنے کان پر ہاتھ رکھ لئے۔

اسپاتا کی روح جس طرح آئی تھی اسی طرح چلی گئی اور خیمہ کے باہر پہرہ دینے والے آقائے طہرانی کو کچھ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ خیمہ کے اندر اتنی دیر تک کیا ہوتا رہا۔ اس لئے کہ خیمہ میں کوئی آواز نہیں گونجی۔ کوئی آہٹ نہیں پیدا ہوئی۔ اور پہرہ دینے کے باوجود طہرانی کو پتہ

ہی نہ چلا کہ ایک خبیث روح ـــ" گذرے ہوئے ماضی کا ایک خوفناک کردار اپنی گفتگو سے محبت کی ماری زلیتھا کا سارا سکون درہم برہم کر کے جا بھی چکا ہے "

اسپاتا چلا گیا ۔ لیکن زلیتھا اسی طرح بت بنی بیٹھی رہی ۔ اس کی نیلی آنکھوں میں کرب و اضطراب کا ایک وسیع سمندر لرز اٹھا ۔ ماضی اور مستقبل سے لڑنے والی زلیتھا درد سے بیتاب ہو گئی ۔ اس کی پلکوں پر آنسوؤں کا پنپنے لگے جیسے نرگس کی پنکھڑیوں پر شبنم کے موتی !

خیمہ کے باہر چاند کی روپہلی کرنیں خاموش فضا میں رقص کر رہی تھیں ، ہوا کے سرد جھونکے جھومتے ہوئے درختوں سے دبی دبی سرگوشیاں کر رہے تھے اور پوری کائنات نیند کی آغوش میں مدہوش ہو چکی تھی ۔ لیکن خیمہ کے اندر شہزادی زلیتھا اپنے دل پر ہاتھ رکھے ایسا محسوس کر رہی تھی جیسے اسپاتا کی پیشین گوئی کے بعد وہ اپنے تمام ارمانوں اور حسرتوں کے ساتھ فنا ہو رہی ہے ۔ رات قبر کی طرح تاریک اور بھیانک ہو گئی ہے ۔ اور باہر وادی میں ہوا کی سرسراہٹ ایسی آواز پیدا کر رہی ہے جیسے ایک ساتھ ہزاروں روحیں بین کر رہی ہوں ۔

اس نے محسوس کیا جیسے وہ خیمہ میں نہیں کسی صحرا میں کھڑی ہے ۔ اس کی قوت بینائی سلب ہوتی جا رہی ہے ۔ وہ چیخنا چاہتی ہے لیکن چیخ نہیں سکتی ، اتمس کو پکارنا چاہتی ہے لیکن پکار نہیں سکتی ۔ رونا چاہتی ہے لیکن رو نہیں سکتی ۔

"دیوی عشتار ۔ میری مدد کر ۔" زلیتھا پوری قوت سے چیخی ۔ اور آقائے طہرانی فوراً خیمہ میں آگیا ۔

شہزادی زلیتھا بیہوش ہو چکی تھی ۔ اس کا پورا جسم پسینہ میں شرابور تھا، سنہرے بالوں کی لٹیں اس کے سفید چہرے کے چاروں طرف ماتم کرنے کے انداز میں رقص کر رہی تھیں ۔ شگفتہ چہرے پر بیکسی اور مایوسی لہریں مار رہی تھی ۔ آقائے طہرانی یہ منظر دیکھتے ہی بدحواس ہو گیا ۔ مدد کے لئے اس نے ڈاکٹر بیگ کو پکارا ۔ اور چند منٹ کے اندر خیمہ میں تمام آدمی جمع ہو گئے ۔

اور جب ڈاکٹر بیگ کی انتہائی جدوجہد کے بعد زلیتھا کو ہوش آیا تو وہ سلیم کی چھاتی سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی ۔" احمس ۔ مجھے مستقبل میں یاس و ناامیدی کے ویران کھنڈروں کے سوا امید کی ایک ہلکی سی کرن بھی نہیں دکھائی دے رہی ہے ۔ اسپاتا کی باتوں نے مجھے مایوسی اور بے بسی کی معراج پر پہنچا دیا ہے ۔ میرے رنگین تصورات کا شیرازہ بکھرتا جا رہا ہے ۔ مجھے بچا لو احمس ۔"

زلیتھا روتی رہی اور سلیم اسے مسلسل تسلّی دیتا رہا ۔ عازم الدین طہرانی، ڈاکٹر بیگ اور مِس فلینسر ۔ سبھی تمام رات خیمہ میں موجود رہے ۔ رات ڈھلتے زلیتھا سو بھی گئی لیکن پھر بھی کوئی شخص خیمہ سے باہر نہیں نکلا ۔

اور جب صبح ہوئی تو ایک اور مصیبت ان کے سامنے کھڑی تھی، بھاگے ہوئے مزدوروں کی مخبری پر قریب کے گاؤں میں رہنے والے مصری کسانوں

کا ایک بہت بڑا گروہ ان کے خیموں کو چاروں طرف سے گھیر چکا تھا۔ اور ان کا یہ محاصرہ اتنا مسلح اور اتنا سخت تھا کہ مقابلہ کی کوئی صورت نہ تھی۔

زلیتھا کو سوتا چھوڑ کر تمام آدمی خیمے سے باہر نکل آئے۔ اور طہرانی نے آگے بڑھکر محاصرہ کرنے والوں سے مصری زبان میں محاصرہ کا سبب دریافت کیا۔

محاصرہ کرنے والوں میں سے ایک شخص جو صورت شکل و لباس کے اعتبار سے انکا سردار معلوم ہوتا تھا آگے بڑھا اور اس نے سخت لہجے میں کہا۔

"میں قبیلہ فراز کا سردار ہوں اور ہمارا مذہب وہی ہے جو مصر کا قدیم مذہب تھا۔ ہم خود کو قدیم مصر کی تمام عمارتوں، مقبروں اور مندروں کا محافظ سمجھتے ہیں۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ لوگوں نے وادی فرلعنہ مصر کے ایک مقبرہ کو توڑ کر اس کی ممی چرالی ہے اور دفن شدہ خزانہ بھی نکال لیا ہے۔ ہم جبر آپ سے یہ امانت واپس لینے آئے ہیں۔ اس لئے قبل اس کے کہ ہم آپ لوگوں پر ظلم کریں ہم آپ سے یہ درخواست کریں گے کہ آپ مصری شہزادی کی ممی اور خزانہ ہمارے حوالے کردیں — ورنہ نتائج کے ذمہ دار آپ خود ہونگے۔"

حملہ آور سردار کا لہجہ اتنا روکھا اور غیر معمولی تھا کہ نہ صرف طہرانی بلکہ تمام لوگ ڈر گئے۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ صورت حال اتنی جلد اتنی سنگین کروٹ لے سکتی ہے۔ لیکن بہر حال اس نئی افتاد کا بھی مقابلہ کرنا ہی تھا۔

طہرانی نے سردار کے مطالبہ کا جواب دیتے ہوئے کہا — معزز سردار ہے

آپ کے مخبر کی یہ اطلاع صحیح ہے کہ ہم نے قدیم مصر کے ایک مقبرہ کو توڑا ہے۔ لیکن یہ اطلاع غلط ہے کہ ہم نے کوئی خزانہ کھودا ہے یا کوئی ممی نکالی ہے۔ اگر یہ درست ہے کہ آپ قدیم مصری عمارتوں کے محافظ ہیں اور آپ کا بھی وہی مذہب ہے جو فراعنہ مصر کا مذہب تھا تو میں آپ سے گزارش کروں گا کہ آپ ہم پر کوئی جبر یا زیادتی کرنے کے بجائے ہم سے ہمارے کام میں تعاون کریں۔ کیونکہ ہم یہاں اپنے کسی ذاتی کام یا ذاتی منفعت کے لئے نہیں فرعون سیتی اوّل کی ایک وصیت پر عمل کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

"میں آپ کی اس الجھی ہوئی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔" سردار کا رویہ اور لہجہ اب بھی سخت تھا لیکن طہرانی جو اپنی عمر میں ایسے کئی معرکے سر کر چکا تھا مطلق ہراساں نہیں ہوا بلکہ اس نے نہایت ٹھنڈے اور دھیمے انداز میں اب تک کی ساری سرگذشت بیان کر دی۔ زلیتھا کی نیند اور حیران کن بیداری کی ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد اس نے کہا۔ "معزز سردار۔ شہزادی زلیتھا صرف اخمس یا سلیم کی نہیں آپ کی بھی ہے۔ اسپاتا کی خبیث روح اسے مسلسل پریشان کر رہی ہے۔ اب یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس کو اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ تو تخمس سوئم کی وصیت کے بموجب زلیتھا کے مقبرہ میں دفن شدہ سونا شہزادی کا جہیز ہے۔ چلئے ہم سب مل کر یہ سونا کھودیں اور پھر آپ ہمارے ساتھ لکسر چلیں تاکہ ہم وہاں اخمس اور زلیتھا کی شادی کر کے یہ سونا ان کے حوالے کر دیں۔"

قدیم مصری فرقہ کا بوڑھا سردار انتہائی حیرت و استعجاب کے ساتھ

یہ کہانی سنتا رہا ۔۔۔ اور پھر اچانک چیخ کر بولا ”دیوی عشتار کی قسم ۔۔ اگر ہم نے شہزادی زلیتھا کو زندہ نہ دیکھا تو میں تم سب کو خود اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں گا ۔۔“

چلو ۔۔ میں تمہارے ساتھ شہزادی کے حضور میں چلتا ہوں ۔۔ “

لیکن قبل اس کے کہ سردار اور اس کے ساتھی اپنے قدم آگے بڑھاتے، وسطی خیمہ کا زرکار پردہ اٹھا ۔۔۔ اور ایک مرمریں بت کی طرح سفید کپڑوں میں ملبوس نیلے گلاب کا پھول ہاتھ میں لئے ہوئے شہزادی زلیتھا باہر آگئی ۔

اور مع سردار کے تمام حملہ آور مصری سجدے میں گر گئے ۔۔۔

طہرانی، سلیم، عازم الدین اور پروفیسر کے علاوہ پارٹی کے تمام افراد نے پیچھے مڑ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی شہزادی کی طرف دیکھا ۔

واقعی اس وقت وہ نیند سے بیدار ہونے والی زلیتھا نہیں ۔۔۔ قدیم مصر کے شاہی خاندان کی سب سے خوبصورت عورت شہزادی زلیتھا تھی ، جس کے گلے میں خاندان فرعون کا امتیازی نشان سونے کا سانپ بل کھایا ہوا پڑا تھا ۔

ڈر اور خوف کے اس ماحول میں شہزادی زلیتھا کے داخل ہوتے ہی ہیبتناک خاموشی چھا گئی ۔ لیکن سلیم ۔۔۔ اس کا دل مبہوت ہونے کے بجائے خوشی اور مسرت سے ناچ اٹھا ۔۔ اچانک ایک زندہ تمنا نے اس کے ذہن میں انگڑائی لی ۔۔ اے کاش اسے اتنا حق حاصل ہوتا کہ وہ یہیں اسی وقت شہزادی زلیتھا کے سنہرے بالوں کی لمبی لٹوں کو اپنی انگلیوں میں پھنسا کر

اس کے سرخ یاقوتی لبوں کا ایک طویل بوسہ لے لیتا۔"

لیکن شہزادی زلیخا کے چہرے پر پھیلے ہوئے شاہانہ وقار اور معاشرہ کی قیود نے اس کی اس تمنا کے بڑھتے ہوئے حوصلے روک دیے ــــ اور وہ صرف اپنی پیاسی آنکھوں سے شہزادی کی طرف دیکھ کر رہ گیا ۔ جو اب سجدہ میں پڑے ہوئے مصریوں کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھی ۔

اب سب کو زلیخا کے اگلے اقدام کا انتظار تھا ۔

باب ـــــــــ ۲۱

چند لمحات کے مکمل سکوت کے بعد فضا میں ایک مرتبہ پھر وہی آواز گونجی جو دو دن بیشتر عازم الدین نے وادیٔ فراعنۂ مصر میں گونجتے سنی تھی۔

زلیخا نے سجدہ ریز مصریوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "قبیلۂ فراز کے بوڑھے سردار فگاتا ـــ میں تجھ سے بھی مخاطب ہوں اور تیرے قبیلہ کے دیگر افراد سے بھی۔ فگاتا ـــ صرف تجھے اس کی اجازت ہے کہ تو اپنا سر سجدہ سے اٹھا اور مجھے بیدار دیکھ کر فرعونِ زماں سیٹی اول کے طبی تجربہ کی کامیابی کے گیت گا۔ میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ تو اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ دوبارہ یہاں آئے۔ میں چاہتی ہوں کہ میں لکسر تک تم سب آدمیوں کے ساتھ جاؤں اور تو اپنے قبیلہ کے تمام افراد کے ساتھ میری شادی کے جشن میں شریک ہو۔ فگاتا ـــ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں احمس سے اپنی شادی لکسر کے

قدیم کھنڈرات میں کروں گی اور قرناق کے ہیکل اعظم کے اس گوشے میں دلہن بن کر اپنے دولہا کا انتظار کروں گی جہاں میں ہزاروں سال قبل اپنی نیند سے پہلے اخمس کی واپسی کے انتظار میں بیٹھا کرتی تھی ۔

فگاتا ۔۔۔ میں جانتی ہوں تیرا سینہ قدیم مصری علم و فن کا مدفن ہے۔ اور ہزاروں سینہ بسینہ منتقل ہو کر تجھ تک پہنچ چکے ہیں اس لئے تو اپنی پوشیدہ قوتوں کے ذریعہ اسپارتا کو تمام تر خباثتوں کا خاتمہ کر دے ۔ تاکہ وہ آئندہ کبھی بھی مجھے پریشان نہ کر سکے ۔

فگاتا ۔۔ میں تجھے حکم دیتی ہوں کہ تو اپنی نظریں اٹھا کر مجھے دیکھ لے تاکہ تجھے اندازہ ہو کہ ہزاروں سال قبل تیرے آبا و اجداد کس خدوخال اور کس شان شوکت کے مالک تھے ۔"

زلیتھا کا حکم پا کر فگاتا نے آہستہ آہستہ پہلے اپنا سر اٹھایا اور پھر لمحہ بھر کے لئے شہزادی کی طرف دیکھ کر دوبارہ اپنی نظریں جھکا لیں ۔ اس کے تمام ساتھی بدستور سجدہ ریز رہے ۔

اب زلیتھا اخمس کی طرف مخاطب ہوئی ۔" اخمس ۔۔۔ قبیلہ فراز[1] کے ان افراد کے آ جانے کے بعد میرے بےچین دل کو قرار آ چکا ہے ۔۔ اب میرے نزدیک دشمن کی حیثیت ایک لومڑی سے زیادہ نہیں رہی جو صرف بھاگنا جانتی ہے مقابلہ

---

[1] قبیلہ فراز کے لوگ غیر معمولی طور پر قدآور، خوبصورت، اور مضبوط ہوتے ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ انکی زندگی بیحد پراسرار رہے ۔

پر ٹھہرنا نہیں جانتی ہے۔ اس لئے احمس بیلے تمہارے فیصلہ کے بموجب میری شادی دیہی نہیں ہوتی لیکن اب لکسر کے نزدیک قرناق کے کھنڈروں میں ہوگی۔ یہ میرے مجبور دل کا فیصلہ بھی ہے اور میری ناکام تمناؤں کی التجا بھی۔"

ابھی سلیم اس شش و پنج میں ہی تھا کہ وہ زلیتھا کو کیا جواب دے کہ عازم الدین جو ابتک یہ تمام منظر خاموشی سے دیکھ رہا تھا درمیان میں بول اٹھا۔ "شہزادی ــــ میں سلیم کی طرف سے تمہارا فیصلہ منظور کرتا ہوں۔ اور ہم سب آج ہی لکسر کی جانب روانہ ہو جائیں گے۔"

عازم الدین کے اس جواب نے زلیتھا کے مغموم اور غیر جذباتی چہرے پر چند لمحات کے لئے مسکراہٹ کی لکیریں پیدا کیں۔ ایک مرتبہ گھوم کر اس نے قبیلۂ فراز کے سردار اور اس کے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور پھر شاہانہ انداز میں سب کو ہاتھ اٹھا کر رخصت ہونے کی اجازت دیدی۔ اجازت ملتے ہی قبیلہ کے تمام افراد اٹھکر ایک قریبی ٹیلے کی آڑ میں چلے گئے۔ طہرانی بھی ان کے ساتھ ہی گیا اور اس نے اسی ٹیلہ کی آڑ میں فگاتا سے لکسر کی جانب روانگی کا پروگرام بنالیا۔ اس نے فگاتا سے یہ بھی طے کرلیا کہ شادی کے موقع پر وہ خود کو زلیتھا کا سرپرست ظاہر کریگا اور پاسپورٹ کی درخواست پر بھی اس امر کی تصدیق کردیگا کہ اس نے ہی بچپن سے زلیتھا کو پالا ہے۔ طہرانی نے مصر کے اس عجیب و غریب قبیلہ کے رہائشی گاؤں کا پتہ بعد دریافت کیا لیکن فگاتا نے بالکل صاف انکار کرتے ہوئے یہ کہدیا کہ اسکا قبیلہ اپنا کوئی راز کسی غیر کو نہیں بتاتا۔

بہر حال اس طرح سے از خود زلیتھا کی روانگی کا مسئلہ طے ہوگیا۔

طہرانی نے واپس آکر اپنے ساتھیوں کو بتادیا کہ فگا تا ایک سرپرست کی حیثیت سے زلیتھا کی روانگی کے کاغذات پر دستخط کرنے لئے تیار ہے۔ پاسپورٹ میں یہ بتایا جائیگا کہ ایک ہندی سیاح نے مصر کی سیاحت کے دوران میں ایک مصری دوشیزہ سے شادی کرلی اور اب وہ اپنی بیوی کو ہندوستان لیجانا چاہتا ہے۔ لکسر میں اسلامی طریقہ پر شادی کی رسومات ہونا بھی طے پاچکا تھا اس لئے یہ قافلہ والوں کو کوئی الجھن نہ تھی اور بظاہر تمام کام انتہائی خوش اسلوبی سے ہو رہا تھا۔

زلیتھا دوبارہ اپنے خیمے میں جاچکی تھی۔

فگا تا کے ساتھیوں کی مدد سے رخت سفر باندھا جانے لگا، اور ادھر طہرانی نے یہ تجویز پیش کی اب مقبرہ سے توتس سوئم کا دفن کیا ہوا سونا بھی کھود کر نکال لیا جائے۔ چنانچہ زلیتھا، عازم الدین طہرانی اور سلیم مقبرہ میں داخل ہوئے۔ مقبرہ کے اندرونی کمروں میں ایک عجیب مایوسی کا عالم طاری تھا اور بالکل ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کل تک یہ مقبرہ زندہ انسانوں کا مسکن تھا لیکن آج واقعی یہ مردوں کی ابدی قیام گاہ ہے۔ کل تک جس تابوت میں زلیتھا زندگی کی نیند سو رہی تھی آج وہاں حسن اصغر کا مردہ جسم قیامت کا انتظار کر رہا تھا۔ تابوت والے کمرہ میں داخل ہوتے ہی سلیم کی آنکھوں میں اپنے دوست گیتاری کے لئے محبت کے آنسو آ گئے۔ اور زلیتھا بھی ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔ توتس سوئم کی لکھی ہوئی جگہ پر کھدائی کی گئی اور واقعی پتھر ہٹاتے ہی ایک سنگی برتن میں سونے کے اتنے ٹکڑے برآمد ہوئے کہ ایک انسان ان کو لاد کر نہیں چل سکتا تھا، چنانچہ فگا تا کے دو آدمی بلائے گئے اور انکے ذریعہ سونا خیموں میں پہنچا دیا گیا

عازم الدین بے حد دولتمند تھا، طہرانی نے بھی اپنی عمر میں بے انتہا دولت دیکھی تھی لیکن یہ سونا دیکھ کر دونوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، ــــ۔ ان کے تصوّر میں بھی نہ تھا کہ سلیم پلک جھپکتے میں اتنی بے پناہ دولت کا مالک ہو جائیگا۔

بہر حال اب صورت حال بالکل پُرسکون تھی اور سب کچھ بلا کسی زحمت کے ہو رہا تھا۔ طہرانی اور عازم الدین خیمہ گاہ کی طرف چلے گئے اور سلیم زلیتھیا کے ہمراہ وادی کی طرف گھومنے چلا گیا، ــــ۔ فگاتا نے ان دونوں کو وادی کی طرف جاتے دیکھا اور پھر جیسے اچانک اسے ایک خیال آیا، چیتے کی طرح جست لگا کر وہ ایک ٹیلے پر چڑھا اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر منھ ہی منہ میں کوئی منتر پڑھنے لگا، ــــ۔

زلیتھا اور احمس ابھی مشکل سے سو قدم آگے بڑھے ہوں گے کہ اچانک ان کے بالکل سامنے ایک سایہ ابھرا، ــــ۔ اور ایک چیخ بلند ہوئی جو سلیم نے نہیں صرف زلیتھا نے سنی، ــــ" زلیتھا تم نے فگاتا کے ذریعہ مجھے فنا کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے۔ اس میں تمھیں کامیابی ہو گئی، ــــ۔ لیکن جاتے جاتے میں پھر کہہ رہا ہوں کہ تم احمس کی نہیں ہو سکتیں، ــــ۔ میرا جسم جل رہا ہے، میں فنا کے بالکل قریب ہوں، فگاتا کے منہ سے نکلے ہوئے دھیم منتروں کا ورد مجھے ختم کر رہا ہے لیکن میں بھی تمھارے بارے میں جو کچھ بتا چکا ہوں اسکو دنیا

کی کوئی قوت نہیں جھٹلا سکتی ۔۔۔۔"

دھیرے دھیرے یہ آواز ڈوبنے لگی، ۔۔۔۔ سایہ روشنی میں تحلیل ہونے لگا، ۔۔۔۔ اور زلیخا کے دیکھتے ہی دیکھتے جو تاریک دھبّہ ابھی اس کے سامنے ابھرا تھا وہ فضا کی روشنی میں منتشر ہوگیا ۔۔۔۔ اسپاتا کا وجود ختم ہوگیا ۔۔۔ زلیخا کی زندگی کا سب سے بڑا خطرہ دور ہوگیا اور سلیم کو پتہ ہی نہ چل سکا کہ ایک کہانی ختم ہوگئی ۔۔۔۔

اسپاتا کا خطرہ ختم ہو چکا تھا لیکن اس کی دھمکی بدستور باقی تھی ۔۔۔۔ زلیخا اس تاریک دھبے کو فضا کی روشنی میں تحلیل ہوتے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ آخر اسپاتا کی اس دھمکی کا کیا مطلب ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ جسم سے مل جانے کے باوجود وہ جسم کی نہ ہو سکے ۔۔۔؟ زلیخا کا دماغ تھک گیا ۔۔۔ ساری دنیا اسے ایک بوجھ معلوم ہونے لگی ۔۔۔ اردگرد کا ماحول فکر میں ڈوبا ہوا دکھائی دینے لگا ۔۔۔ آنکھیں غم کے تصوّرات بند ہونے لگیں ۔۔۔۔ اور اس نے سکون کے لیے اپنا سر سلیم کی چھاتی سے لگا دیا ۔۔۔۔

ادھر وادیٔ فراعنۂ مصر میں سلیم اور زلیخا دنیا و مافیہا سے بے خبر ایک دوسرے سے اپنے مستقبل کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اور ادھر خیمہ گاہ میں طرانی ڈاکٹر بیگ سے کہہ رہا تھا "یہ لڑکی جس کی آواز میں موسیقی کا نوحہ بھرا ہوا ہے اور جو ہزاروں سال تک وادی خموشاں میں سوتی رہی ہے اس پوری دنیا کے لیے بڑی کارآمد ہو سکتی ہے اگر ہمیں وہ اپنی یادداشت کے بل پر اس علم کی تفصیل بتاوے جو فنا ہو چکا ہے اور

جس کی مدد سے علم آثار قدیمہ، طبابت، عمل جراحی اور جسمانی ساخت سے متعلق تمام علم و فن میں زبردست انقلاب لایا جا سکتا ہے۔"

"آقائے طہرانی آپ کچھ بھی کہیں ۔۔۔ لیکن میرا اپنا یہ عقیدہ ہے کہ جسم اور روح کے درمیان جو رشتہ ہے اس کی تفصیل ہم کسی قیمت پر نہیں حاصل کر سکتے" عاذم الدین نے کہا۔

"عقیدہ اور سائنس دو الگ الگ چیزیں ہیں اور اسکی بحث نہیں ہو سکتی ہے ایس اتنا ضرور کہوں گا کہ اگر طہرانی کی کوششوں سے زلیخا نے ماضی کے اس زبردست تجربہ کے بارے میں کچھ بھی بتا دیا تو یہ ہمارے اس سفر کا دوسرا سب سے بڑا کارنامہ ہوگا" ڈاکٹر بیگ نے گفتگو میں مداخلت کی۔

ابھی شاید یہ گفتگو اور ہوتی کہ زگاتا نے آ کر پہلے ایک لمبا سلام کیا اور اس کے بعد یہ اطلاع دی کہ تمام سامان اس کے آدمی باندھ چکے ہیں اور اب سب کو صرف روانگی کے حکم کا انتظار ہے۔ زگاتا نے تمام مہمانوں کے لیے سواری کے گھوڑوں کا بھی انتظام کر دیا تھا۔ لیکن روانگی کیسے ہوتی جبکہ ابھی تک سلیم اور زلیخا وادی سے واپس نہیں آئے تھے۔

اجڑی ہوئی اس خیمہ گاہ میں جہاں صبح تک ہندوستان سے آئے ہوئے چند سیاحوں نے ایک بستی سی بسا رکھی تھی زلیخا کی واپسی کا انتظار ہو رہا تھا اور دور وادی کے ایک کھنڈر میں زلیخا اپنے محبوب سے کہہ رہی تھی "ایک طویل کہانی کا خاتمہ قریب ہے احسن ۔۔۔ آج شام کو قرنات کے دیرانے میں میری اور تمھاری دوسری شادی ہوگی اور اس کے بعد ایک نئی کہانی

شروع ہو جائے گی"۔۔۔

"ہاں زلیخا۔۔۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ جوانی کے محبت بھرے خوابوں سے زیادہ زندگی میں کوئی چیز حسین نہیں ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ میرے خیال میں اس پوری کائنات میں تم سے زیادہ خوبصورت کوئی شے ممکن نہیں ہے ۔۔۔ اور میری کتنی بڑی خوش قسمتی ہے کہ اس چیز کا مالک میں ہونے جا رہا ہوں"

"اور مجھے جھلمل جھلمل کرتے ستاروں کی چمک میں، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں، بارش کے گیت میں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو محض تمہاری قربت میں حاصل ہوتا ہے"۔ زلیخا نے جذباتی آواز میں کہا اور اس کے بالوں میں اپنی لمبی مخروطی انگلیاں پھنسائیں۔ اور سلیم زلیخا کے ان باریک لبوں کی طرف دیکھتا رہ گیا جو گلاب کی پنکھڑی سے زیادہ نرم اور سرخ تھے، رعب حسن سے سلیم کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی ۔۔۔

زلیخا اپنی جھیل ایسی نیلی آنکھوں سے مسلسل اسکی طرف دیکھ رہی تھی ۔۔۔ اور سلیم سوچتا رہا۔" ہاں یہ وہی عورت ہے جسے ارضی و سماوی قوتوں نے ہزاروں برس تک اپنی دعاؤں اور برکتوں کے سائے میں رکھا ۔۔۔ وہی عورت جس نے سو دروازوں والی راجدھانی تھیبز میں تخت شاہی پر بیٹھ کر عظیم الشان سلطنت کا انتظام کرنے والے سیٹی اول کے حکم پر بظاہر خود کو قربان کر دیا تھا ۔۔۔ وہی عورت جو اس سے ملنے کے لیے موت تک کے دروازے پر دستک دیکر لوٹ آئی تھی ۔۔۔"

دیر تک دونوں اسی طرح خاموش کھڑے رہے اور پھر مزید کوئی گفتگو کیے بغیر خیمہ گاہ کی طرف لوٹ آئے جہاں ہر شخص انکا منتظر تھا۔۔۔ روانگی کے لیے قافلہ بالکل تیار تھا۔ زلیخا کو دیکھتے ہی قبیلۂ زار کے تمام لوگ سجدہ میں گرے لیکن زلیخا نے ان کو کھڑے ہونے کا حکم دیا اور اس کے بعد ایک سفید گھوڑے پر بیٹھ کر لکسر کی جانب روانہ ہوگئی۔

پورا قافلہ اس کے پیچھے تھا۔ اور یہ قافلہ اس طرح لکسر کی جانب بڑھ رہا تھا جیسے واقعی کسی ملکہ کا جلوس جا رہا ہو۔۔۔ دور درختوں اور اونچے نیچے ٹیلوں کے جھرمٹ میں خاموشی اور سکون کے ساتھ نیل بہہ رہا تھا۔۔۔ زلیخا کبھی بہتے ہوئے نیل کی طرف دیکھتی اور کبھی مضافات میں پھیلے ہوئے ویرانوں کی طرف۔۔۔

یہ ویرانے کبھی آباد تھے۔۔۔ کبھی ان ویرانوں میں زندگی اپنی معراج پر تھی، ہر جانب شان و شوکت کے مظاہرے تھے، پرشکوہ عمارتیں تھیں، پرہیبت مندر تھے۔۔۔ بارعب کاہن تھے۔۔۔ خوبصورت عورتوں کے زندہ مجسمے تھے۔ کاروبار سے بھرپور بازاریں تھیں۔۔۔ لیکن آج۔۔۔ زلیخا اس ویرانے کی گزری ہوئی کل بھی دیکھ چکی تھی اور آج کی ویرانی بھی۔۔۔ نہ معلوم کیوں اسکی گھنی پلکوں میں آنسو تھرتھرا اٹھے۔۔۔

دور بہت دور سے کسی دیہاتی مسجد کے بلند مینار سے ظہر کی نماز کے لیے مؤذن کی آواز بلند ہوئی۔۔۔ مؤذن لوگوں کو سچائی اور نیکی کی طرف بلا رہا تھا۔ "اللہ اکبر۔۔۔ لا الہ الا اللہ"، اور مؤذن کی یہ آواز پوری فضا کے

سناٹے میں پھیل کر یہ اعلان کر رہی تھی کہ خدا سب سے بڑا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے" قافلہ کے افراد اپنی زندگی میں ہزاروں مرتبہ اذان سن چکے تھے لیکن آج انھیں ان معجزانہ الفاظ کا صحیح مطلب معلوم ہوا آج اس آواز نے ان کو ایک خاص قسم کا روحانی کیف دیا — آج انھیں محسوس ہوا کہ سنسان اور تنہا راستوں میں کون سب سے بڑا رہبر ہوتا ہے — اور آج انھیں احساس ہوا کہ زندگی کی پے در پے مشکلات پر صرف اسی آواز پر لبیک کہہ کر قابو پایا جا سکتا ہے — مغربی تعلیم کا پرستار سلیم اس آواز کو سن کر سوچنے لگا کہ صبر و استقلال کی زندگی کے لیے اسلام کا فلسفہ کتنا حکیمانہ اور کتنا حتمی ہے — اور پھر بالکل غیر ارادی طور پر اس نے گھوڑا روک دیا — قافلہ کے تمام ہندوستانی مسافروں نے اسکی تقلید کی — اور ابھی موذن کی اذان ختم بھی نہ ہونے پائی تھی کہ سلیم اور اسکے ساتھیوں نے نماز کی صف باندھ لی اور اپنے ان دیکھے خدا کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے —

نماز ہوتی رہی اور زلیخا رکوع و سجود کا یہ روحانی منظر دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ احمس اور اس کے ساتھی کس خدا کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں جبکہ کوئی خدا ان کی نگاہوں کے سامنے موجود نہیں ہے — چنانچہ جب نماز سے فراغت پانے کے بعد قافلہ دوبارہ لکسر کی جانب روانہ ہوا تو اس نے سلیم سے پوچھا کہ وہ سب کس خدا کے سامنے سجدہ کر رہے تھے —

"اس خدا کے سامنے جو لاشریک ہے جس کے رسول محمد عربی ہیں اور جن کے حکم سے تم ہزاروں سال تک علم طب کے سہارے سوتی رہیں"

•

سلیم نے جواب دیا اور زلیخا خاموش سی ہو گئی۔ بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ
انسانی جسم کو خدا سمجھ کر اسکی پرستش کرتی رہی ہو۔ اتنی جلدی اپنے خدا
اور اس خدا کے ہزاروں بیٹوں کے وجود کو رد کر دیتی۔

اب لکسر کی آبادی بھی دور سے دکھائی دے رہی تھی،

''احمس۔ ہم لکسر نہیں۔ قرناق جائیں گے، اس لیے کہ قبیلۂ فراز
کے لوگ آج تک کسی ایسی آبادی میں داخل نہیں ہوئے جس میں ان کے مذہب
کو ماننے والے نہ رہتے ہوں۔'' زلیخا نے کہا اور گھوڑے کی باگ کھینچ لی۔

''لیکن قرناق کے ویرانے میں شادی کا انتظام کیسے ہو سکتا ہے۔''
سلیم نے پریشان ہو کر کہا۔

''کچھ بھی ہو۔ تمھارے مذہب کی تمام رسومات وہیں ادا ہوں گی
اور میں قرناق میں ہی دلہن بنونگی۔ یہ میرے قبیلہ کی رائے ہے اور مجھے
ہر حال ان کے جذبات کا احترام کرنا ہے۔''

اس گفتگو کے دوران میں پورا قافلہ ٹھہر چکا تھا اور تمام افراد کو صرف
اسکا انتظار تھا کہ ان کو کس طرف روانگی کا حکم دیا جاتا ہے۔ لکسر کی جانب
یا قرناق کے ویران کھنڈروں کی جانب۔

''ہمیں قرناق کی طرف جانا ہے۔'' قافلہ والوں نے سلیم کی آواز سنی اور
سب کے سب قرناق کی قدیم شاہراہ پر گامزن ہو گئے۔ راستہ میں طرائی لے
حازم الدین سے شادی کی رسومات کی ادائیگی کے سلسلے میں تفصیلی طور پر بات کی
۔ پہلے یہ فیصلہ ہوا کہ لکسر سے مولوی بلا کر نکاح پڑھوا لیا جائے لیکن چونکہ ایسی

انشائے راز کا ڈر تھا اس لیے یہ فیصلہ ہوا کہ نکاح کا صیغہ خود طہرانی پڑھ دے اور اس طرح زلیخا اسلامی طریقہ پر سلیم کی ہو جائے گی۔

طہرانی کے خیال میں زلیخا کی ہزاروں سال پرانی کہانی کا خاتمہ ہونا تھا لیکن اے کاش اسے معلوم ہوتا کہ اس کہانی کا انجام کیا ہوگا۔ پچھلوں حالات اچانک کتنی حیرت ناک کروٹ لے لیں گے۔

تقریباً ۵ بجے شام کو قافلہ قرناق کے ہیکل کے قریب پہونچ گیا اور قبیلۂ فراز کے آدمیوں نے انتہائی مستعدی اور پھرتی کے ساتھ خیمے نصب کرنا شروع کردیے۔ ان کے سردار کا حکم تھا کہ شام سے پہلے کام ختم ہو جائے شہزادی کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قبیلہ کے افراد نے غیر معمولی محنت کے بعد اس ویرانے کو ایک اچھی خاصی آبادی میں تبدیل کر دیا۔ شام قریب تھی اور ڈوبتا ہوا سورج جو ہزاروں سال سے قرناق کی تباہی اور ویرانی کا خاموش تماشائی بنا ہوا تھا آج ایک عجیب و غریب منظر دیکھ رہا تھا۔

آج قرناق کے کھنڈروں میں دو تہذیبوں کا ملاپ ہو رہا تھا۔ ایک طرف قبیلۂ فراز کے افراد اپنے قدیم مصری خدوخال، لباس اور اپنے دل میں مذہبی احترام کا جذبہ لئے ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے تو دوسری طرف جدید تہذیب اور نئی دنیا کے چند انسان شادی کے انتظامات میں الجھے ہوئے تھے۔ اگر ایک طرف زلیخا اپنے شاہی طرز کے خیمے میں خود اپنے ہاتھوں خود کو قدیم مصری انداز میں دلہن بنا رہی تھی تو دوسری طرف

لدین اپنے اکلوتے بیٹے کو دولہا بنا رہا تھا۔۔۔۔

رح قزناق کے کھنڈروں میں ماضی کے گم شدہ اوراق زندہ حقیقت سامنے آرہے تھے۔۔۔۔ اور ایک ایسا واقعہ ہونے جا رہا تھا جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔۔ قزناق کے یہ کھنڈر ہزاروں سال کی آرزوؤں، اور حسرتوں کے سنگم بننے جا رہے تھے۔۔ اور یہاں کا منظر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس ویرانے میں کچھ روحوں نے اپنا مسکن بنا لیا ہو ہر شخص خاموش تھا، سنجیدہ تھا، اور ہر دل اس طرح رہا تھا جیسے وہ کسی شادی میں نہیں کسی عدالتی کارروائی میں شریک ۔۔۔۔

ب شام ہو چکی تھی۔۔۔ سلیم دولہا بن چکا تھا لیکن زلیخا کے دلہن بن جانے کی ع اب تک نہیں آئی تھی۔۔۔ چنانچہ طرانی نے سوچا کہ وہ خود جا کر س خیمہ تک پہونچا دے، جہاں نکاح ہونا تھا۔۔ اس فیصلہ کے بعد وہ کے خیمہ تک گیا۔۔ اندر آنے کی اجازت مانگی اور جب اجازت پاکر یا تو اس نے اپنی بوڑھی آنکھوں سے جو کچھ دیکھا اس نے اسے بھی چند کے لیے بالکل مدہوش کر دیا۔۔۔

نکہ اس کے سامنے ایک خوبصورت مسہری پر جو عورت لیٹی ہوئی تھی نہیں قوس قزح تھی، رنگوں کا ناقابل تشریح امتزاج۔۔ لہروں کی بنتا اور ایک جاتا ہوا رنگ۔۔ لمحہ بھر کے لیے طرانی کو ایسا محسوس رح عمر میں پہلی بار وہ کسی شاعر کے شعر کو ایک ناقابل تصور نسوانی پیکر

میں دیکھ رہا ہے۔ــــ وہ کسی مغنی کے راگ کو زندگی کی کروٹیں لیتے ہوئے دیکھ رہا ہے ــــ وہ کسی مصوّر کے خیال کو جوانی کی بھرپور سانسیں لیتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ــــ جیسے آج اس خیمہ میں وہ پھول کی خوشبو، ستاروں کا نور اور چاندنی کی کرنوں کا مسرت بھرا رقص دیکھ رہا ہے۔ــــ

چند لمحات کی اس غور اور مدہوشی کے بعد طہرانی نے ہلکی آواز میں پوچھا

"کیا شہزادی بحیثیت دلہن پوری طرح تیار ہیں"ــــ

"ہاں ــــ میں بالکل تیار ہوں لیکن سلیم کے پاس جانے سے قبل میں قبیلہ قزاز کے سردار ذنگاتا سے تخلیہ میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں ــــ لیے آپ اسے میرے پاس بھیج دیجیے اور اس کا خیال رکھیے کہ کوئی شخص ہم دونوں کی گفتگو نہ سن سکے"ــــ

"میں ذنگاتا کو ابھی آپ کی خدمت میں بھیجتا ہوں" ــــ طہرانی نے جو ــــ اور اسکا پورا خیال رکھونگا کہ کوئی شخص آپ دونوں کی گفتگو کے میں اس خیمہ کے قریب تک نہ آنے پائے"

"آپ سلیم کے خیمہ میں میرا انتظار کیجیے ــــ میں ذنگاتا کے ساتھ ہی پہونچ جاؤنگی"، شہزادی نے اپنی بات ختم کرتے ہی کچھ ان نظروں سے کی طرف دیکھا کہ وہ فوراً خیمہ کے باہر چلا گیا اور ذنگاتا کو اطلاع دے اسے شہزادی زلیخا نے اپنے حضور میں طلب کیا ہے ــــ

اور اب خیمہ میں ذنگاتا اور زلیخا میں گفتگو ہو رہی تھی۔

زلیخا نے افسردہ لہجے میں کہا ــــ "ذنگاتا تم خوب جانتے ہو کہ میں

ہوں؟ میرا خاندان کیا ہے؟ میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اور میں ابتک کیوں زندہ رہی"

"میں خوب جانتا ہوں شہزادی ۔۔۔ دیوتاؤں کی قسم میں تو آپ کو دیوی عشتار کی بیٹی سمجھ رہا ہوں کیونکہ میں نے عالم تصور میں دیوی عشتار کی جو تصویر دیکھی ہے اسمیں اور آپ میں بظاہر کوئی فرق نہیں ۔" نگاتا نے نظریں جھکا کر کہا۔

"لیکن میں بہت پریشان ہوں نگاتا ۔۔۔ رہ رہ کر مجھے اسپاتا کی دھمکی یاد آجاتی ہے اور میں یہ سوچنے لگتی ہوں کہ اسپاتا نے فنا ہوتے ہوئے آخر یہ کیوں کہا تھا کہ میں احسن کی ہوجانے کے باوجود احسن کی نہیں ہوسکتی ۔" شہزادی کے لہجے میں بلا کی غمگینی مستور تھی۔

"عالی مقام شہزادی ۔۔۔ آپ اسپاتا کی حاسدانہ دھمکی کا وہم دل میں نہ لائیے اور مطمئن رہیئے کہ دیوتاؤں کا سایہ آپ پر باقی ہے اور دنیا کی کوئی قوت احسن کو آپ سے نہیں چھین سکتی ۔"

"پھر بھی ۔۔۔ نہ معلوم کیوں میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔ جبکہ آج میری شادی ہے، آج کی رات میری سہاگ رات ہے اور مجھے بے پناہ حد تک خوش ہونا چاہیئے ۔"

"یقین جانیئے شہزادی ۔ جب تک نگاتا زندہ ہے آپ کو اسپاتا کی دھمکی کے زیر اثر کوئی صدمہ نہیں پہونچے گا ۔ جہاں تک میرا علم بتاتا ہے اسپاتا بالکل فنا ہوچکا اور اب اس کے وجود کا ہلکا سا شائبہ بھی باقی نہیں ہے"

ـــــ اس لیے اے فراعنۂ مصر کی آخری زندہ شہزادی آپ غم اور وہم سے بالکل بے نیاز ہو کر خیمے سے باہر نکلیے ـــــ احمس کے خیمہ میں تمام لوگ آپ کے منتظر ہیں اور میرے آدمی آپ کی شادی کا استقبالیہ جشن کرنے کے لیے بالکل تیار ہیں ـــ" ژگاتا نے یقین بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا تم شادی کا قدیم رقص کرو گے ـــ" زلیخا نے معصومانہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں شہزادی ـــ صدیاں گذر گئیں کہ ہم نے یہ رقص نہیں کیا ـــ لیکن آج دیوتاؤں کی مہربانی سے یہ موقع مل گیا ـــ" ژگاتا نے جواب دیا۔

"پھر چلو ـــ میں تیار ہوں ـــ" زلیخا نے کہا اور باہر جانے کے لیے کھڑی ہو گئی۔

اور پھر سلیم کے خیمہ میں بیٹھے ہوئے سیاحوں نے دیکھا کہ گو آفتاب ڈوب چکا ہے لیکن پھر بھی ایک آفتاب ان کے خیمے کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔

آخری باب

اور اب زلیخا سلیم کے خیمہ میں تھی!

خیمہ کے باہر قبیلہ فراز کے لوگ جلتی ہوئی مشعلیں ہاتھ میں لیے کھڑے تھے ــــ اور صرف اس کے منتظر تھے کہ نکاح کا اعلان ہوتے ہی وہ استقبالیہ رقص شروع کر دیں ــــ دور وہ بڑا پتھر بھی نظر آ رہا تھا جس پر کھڑے ہو کر مصری روایات کے بموجب ان دونوں کو اپنی ازدواجی زندگی کا اعلان کرنا تھا ــــ ہر طرف تاریکی تھی کبھی کبھی بادلوں کی اوٹ سے چاند اپنی جھلک دکھاتا لمحہ بھر کے لیے فضا میں روشنی پھیلتی اور اس کے پھر تاریکی چھا جاتی ــــ

خیمہ کے وسط میں سلیم دولھا بنا بیٹھا تھا۔ ایک طرف عازم الدین اور دوسری جانب ڈاکٹر بیگ بیٹھے تھے ــــ اور طرانی زلیخا کے سامنے بیٹھا تھا۔ ڈگاتا خیمہ کے دروازے پر ادب سے کھڑا تھا، خیمہ کے پورے ماحول پر ایک

عجیب سا اسرار چھایا ہوا تھا، اور ہر شخص کے چہرے پر مسرت کے بجائے ایک دبا دبا سا خوف پھیلا ہوا تھا۔ سہرے کے پھولوں کی آڑ سے سلیم نے نیچی نظروں سے زلیخا کے پھول سے چہرے کو دیکھا جو ایک باریک کپڑے سے ڈھکا ہوا تھا اور یہ دیکھ کر اس کو انتہائی حیرت ہوئی کہ اس کے آفتابی رخساروں پر آنسوؤں کی دو بوندیں ڈھلک رہی ہیں۔ سلیم کو پورا یقین تھا کہ زلیخا ایک عزم صمیم رکھنے والی خاتون ہے جس کے پائے استقامت کو کبھی لغزش نہیں ہوتی، چنانچہ اس نے سوچا کہ آخر وہ کون سا خوف یا شک ہے جس کی بنیاد پر زلیخا اس وقت غم و افسوس کے آنسو بہا رہی ہے۔ اور پھر سلیم کو ایسا محسوس ہوا جیسے ماضی کا ایک نامعلوم سا پردہ، جو شعور انسانی سے بالاتر ہے اس کے خیالات پر چھاتا جا رہا ہے ابھی شاید وہ کچھ اور سوچتا کہ طرانی نے اسلامی رسم کے بموجب پہلے زلیخا سے اور پھر سلیم سے اس شادی پر انکی توثیق مانگی اور جب دونوں نے "ہوں" کہدی تو نکاح کا صیغہ پڑھنا شروع کر دیا۔

یہ سارا کام بھی چند منٹ میں ہو گیا، تمام افراد نے عازم الدین کو مبارکباد دی اور اس طرح زلیخا اسلامی قانون کے تحت ہمیشہ کے لیے سلیم کی ہو گئی۔ قنکاتا نے فوراً باہر جا کر اپنے قبیلہ کے آدمیوں کو شادی کی اطلاع دی اور باہر طبل کی زور دار آواز کے ساتھ ایک ایسا رقص شروع ہو گیا۔ جو ہزاروں سال سے اس سرزمین نے نہیں دیکھا تھا۔

ایک عجیب و غریب رقص جس میں قدم قدم پر ہر ناچنے والے کے لیے موت کا خطرہ تھا۔ طبل کی آواز کے ساتھ قبیلۂ فراز کے آدمی پیر پٹکتے۔ اور

اچھل اچھل کر اپنی تلواروں سے سامنے والے شخص پر حملہ کرتے ۔۔۔ چند آدمی بے ہنگم آواز سے کوئی مذہبی گیت بھی گا رہے تھے۔ گویا اس طرح قرناق کے کھنڈر ایک مرتبہ پھر اپنے معماروں کے دور حکومت میں ماضی کی تمام دیواروں کو سمیٹ کرتے ہوئے واپس لوٹ گئے تھے۔

رقص کے دوران میں ہی فنگاتا نے اندر آ کر کہا "سب کچھ تیار ہے شہزادی عالی مقام ۔۔۔ آئیے اب باہر چلیں ۔۔۔ تاکہ آپ کے حکم کے بموجب پتھر کے چبوترے پر آخری رسم بھی ادا کر دی جائے ۔۔۔"

"کیسی رسم ۔۔۔؟" عازم الدین نے گھبرا کر سوال کیا۔

"قدیم مصری رسومات کے بموجب ۔۔۔ اس چبوترے پر جو کبھی ہیکل کے وسط میں تھا ہر دلہن تمام افراد کی موجودگی میں اپنی زبان دولہا کے منہ میں دیتی تھی اور اس کے بعد یہ اعلان کر دیا جاتا تھا کہ روحانی اتصال کے ساتھ ہی ساتھ دونوں کے جسم بھی ایک ہو گئے ہیں۔ یہ ایک عجیب و غریب رسم تھی اور سہاگ رات سے قبل جسمانی اتصال کے عوامی مظاہرے کا یہ تصوّر بھی کچھ کم حیرتناک نہ تھا۔ چنانچہ اپنے مقصد کو مکمل طور سے پورا کرنے کے لیے زلیخا نے بھی یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ نہ صرف اپنی سسرال والوں کے سامنے بلکہ قبیلۂ فراز کے تمام افراد کی موجودگی میں یہ رسم ادا کرے گی تاکہ ہر رسم کے بموجب اس کا ہو جائے اور آیندہ زندگی میں کوئی اس پر اعتراض نہ کر سکے۔"

عازم الدین اور طہرانی کو یہ رسم قطعی پسند نہ تھی۔ انھوں نے کہا بھی کہ وہ

اس غیر مہذب اور لغو رسم کی اجازت ہرگز ہرگز نہیں دیں گے ۔ لیکن قبیلۂ فزار کے آدمیوں کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں دیکھ کر ان کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اپنی ضد پر قائم رہیں ۔ اب زلیخا بھی خوش نظر آ رہی تھی، اور شرما بھی۔

باہر قبیلۂ فزار کے آدمیوں کا وحشیانہ رقص بدستور جاری تھا، طبل اور ڈھول کی مہیب آوازوں اور کاہنوں کے مردہ گیتوں کی بھیانک لے نے ماحول کو بالکل قدیم معاشرہ کے سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ اور خیمہ کے اندر زلیخا احمس کی طرف ان نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ نظروں ہی نظروں سے اپنی محبت، اپنی پاکیزگی اور اپنی جوانی کا سارا رس احمس کی آنکھوں میں انڈیل کے رکھ دے گی ۔

شادی کا تحفہ بطور طہرانی نے زلیخا کو ایک قیمتی انگوٹھی اور ڈاکٹر بیگ نے عطر کی ایک شیشی دی ۔ اور اس کے بعد دلہن کا جلوس ہیکل کے تخت کی جانب روانہ ہو گیا ۔

جلوس میں سب سے آگے فزار کا ایک ایسا بانس لیے چل رہا تھا[عل] جس کے بالائی سرے پر لمبے بالوں کا ایک گچھا بندھا ہوا تھا، اس کے پیچھے بے ہنگم طور پر رقص کرتے ہوئے قبائلی تھے، پھر طبل بجانے والے تھے ۔ نازک نازک قدم اٹھانے والی زلیخا تھی ۔ برابر میں سلیم تھا اور اس کے پیچھے ہندوستانی سیاح ۔ جس میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا ڈاکٹر بیگ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ یہ اس کی انتہائی خوش قسمتی ہے کہ وہ بیسویں صدی میں ۳½ ہزار سال

علہ اس قسم کا جھنڈا یوپی کے مشرقی اضلاع میں بالے میاں کا جھنڈا بطور آج بھی دیکھا جا سکتا ہے

پرانی ایک دیسی رسم کو دیکھ رہا تھا۔ جو خواب میں بھی دیکھنا ممکن نہیں تھا۔۔۔

بار بار زلیخا۔۔۔ احمس کی طرف اور سلیم زلیخا کی طرف دیکھتا، ایک دوسرے سے بات کرنے کے لیے دونوں کی بیقراری اپنی معراج پر پہونچ چکی تھی لیکن دونوں مجبور تھے۔۔۔ دونوں جدید اور قدیم معاشرہ کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے تھے اور دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سوچ رہے تھے کہ بس۔۔۔ تھوڑی دیر اور۔۔۔ اس کے بعد ہم دونوں ہر قسم کی پابندیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائیں گے۔

ماحول کی دہشت بھی دھیرے دھیرے ختم ہو گئی تھی، اب ہر شخص مسرور تھا۔۔۔ زلیخا کے ذہن سے بھی اسیاتا کی منحوس دھمکی کا اثر زائل ہو چکا تھا وہ بھی خوش تھی۔۔۔ اور اسکا چہرہ دیکھ کر بالکل ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بارش سے نہایا ہوا گلاب کا کوئی سرخ پھول۔۔۔

دھیرے دھیرے خوشی اور مسرت میں ڈوبا ہوا یہ جلوس قدیم ہیکل کے چبوترے تک پہونچ گیا۔۔۔ اور دولھا دلہن کی حیثیت سے زلیخا اور سلیم اس چبوترے پر چڑھ کر کھڑے ہو گئے، قبیلہ کے تمام آدمیوں نے ان کو اپنے محاصرہ میں لے لیا۔۔۔ اور نگاتا نے آگے بڑھ کر پہلے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور پھر اپنی قدیم زبان میں کوئی منتر پڑھنے لگا، اب ہر طرف خاموشی تھی، چاند کی کرنیں دولھا اور دلہن پر اپنی نورانی کرنوں کی بارش کر رہی تھیں اور فضا میں ہر طرف نگاتا کے منتروں کی آواز گونج رہی تھی، اور سلیم اپنی بیوی کی نیلی آنکھوں کی طرف مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔۔۔

اچانک زلیخا نے انتہائی ہلکی آواز میں سلیم سے کہا " احمس ___ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا لیکن میں نے غم واندوہ کے تلخ اور طویل لمحات گزار کر وقت کا انتظار کیا ___ اور جس طرح سمندر کی آغوش تلاش کرنے والی ندی کو کوئی نہیں روک سکتا، یا جس طرح سورج کی کرنوں کو کوئی نہیں ٹھنڈا کر سکتا اسی طرح مجھے بھی کوئی قوت میرے ارادے سے نہیں باز کر سکی، حد یہ کہ میں بیدار ہو گئی اور یہ کام تمہارے ہی ہاتھوں سرانجام پایا ___"

اور احمس نے اسی دھیمے لہجے میں جواب دیا " ہاں زلیخا ___ یقین جانو تمہارا تصور مجھے بھی سدا بہار پھولوں کے کنج کی سیر کراتا رہا ___ میں عالم خواب میں تمہاری ہنسی کی آواز سنتا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے چاند کی کرنوں سے سجے ہوئے تاروں پر کوئی نغمہ چھیڑ دیا گیا ___ میں اکثر آنکھیں بند کر کے تمہارے حسن کے بارے میں سوچتا رہتا ___ اور پھر خود ہی اپنے دل سے پوچھتا " یہ کیسی تصویر ہے جو میرے تصور کے ہر گوشے میں گھستی چلی جا رہی ہے ___ اس اجنبی حسن میں ہزاروں شعلوں کی ایسی تپش اور سپیدۂ سحر کی سی پاکیزگی کہاں سے آگئی ___"

ابھی غالباً سلیم کچھ اور کہتا کہ نگاتا نے اپنا منتر ختم کر دیا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ دیا جس کے بعد ایک مرتبہ پھر اس چبوترے کے چاروں طرف رقص شروع ہو گیا ___ اس مرتبہ رقص کی رفتار تیز تھی ___ طبل کی دھڑکن میں وارفتگی تھی، اور کاہنوں کے لبوں سے نکلے ہوئے گیتوں میں موسیقی کے ساتھ ہی ساتھ ایک تڑپ بھی تھی ___ اور سلیم کا مسرت کے سمندر میں

ہاہر چپا مارتا ہوا ذہن صرف زلیتھا کے حجلۂ عروسی کا، وہاں کی مدھم روشنی کا، پھولوں سے سجی ہوئی ایک سیج کا۔۔۔ اپنی سمٹی ہوئی محبوبہ کا،۔۔۔ اس کی سرگوشیوں کا اور لباس کی سرسراہٹوں کا تصور کر رہا تھا۔۔۔۔

کبھی وہ رقص کرتے ہوئے قبائلیوں کی طرف دیکھتا اور کبھی زلیتھا کی طرف جس کے ملکوتی چہرے پر اس وقت ایک کنواری دوشیزہ کا تقدس اور ایک نئی نویلی دلہن کا اچھوتا وقار پوری شدت کے ساتھ نمایاں تھا۔۔۔ اور نہیں بیان کیا جا سکتا کہ اس وقت آسمان پر چاند سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے بادلوں کے ٹکڑے۔۔۔ یا بے حس و حرکت کھڑے ہوئے کھجور کے گنجان درخت اس وقت کون سا منظر دیکھ رہے تھے۔۔۔ لیکن بظاہر ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس واقعہ سے متعلق تمام روحیں آسمان سے اتر کر نیچے ویرانوں میں آگئی ہیں۔۔۔ مری ہوئی تہذیب ایک مرتبہ پھر زندہ ہو گئی ہے۔۔۔ محبت کا وہ معصوم اور ننھا چراغ جسے وقت کے ظالم ہاتھوں نے بجھا دیا تھا ایک مرتبہ پھر روشن ہو گیا ہے، ظلمتوں کے افق پر ایک معصوم محبت کا ستارہ طلوع ہو کر روشنی کی بارش کر رہا ہے اور چاروں طرف نور کا ایک سیلاب سا امنڈ آیا ہے۔۔۔۔

اور اس ماحول میں سلیم کی شادی ہو رہی تھی۔۔۔ شادی۔۔۔ دنیا کا سب سے پاکیزہ رشتہ۔۔۔ وہ شادی جس کے بغیر آدمی کے نزدیک باغ عدن میں بھی کوئی کشش نہ تھی، اور ان کو فرشتوں کے گیت، خوش الحان پرندوں کے چہچہے، پھولوں کی مسکراہٹ، بہار کے مہکے ہوئے جھونکے سب بے اثر اور

پھیکے معلوم ہوتے تھے۔ اور جب ان کی زندگی میں خدا کی سب سے قیمتی اور انمول تخلیق عورت کی صورت میں داخل ہوئی تو ان کی آہیں مسکراہٹوں میں بدل گئیں ان کا ہر دکھ اور ہر درد دُور ہو گیا اور خوشی کے زمزموں سے باغ عدن کا گوشہ گوشہ جھوم اٹھا۔

آج سلیم بھی آدم کی اسی خوشی سے روشناس ہو رہا تھا۔ آج اس کے بالکل قریب ایک عورت کھڑی تھی۔ عورت ـــ جو کائناتی حسن کا لازوال خزانہ ہے۔ جو انسانی راحت کا سرچشمہ ہے، جس کی ذات میں نیکی کا ہر جوہر موجود ہے اور جس کے طفیل میں ہی انسانیت کی تمام قدریں قائم اور باقی ہیں۔

تقریباً پندرہ منٹ کے بعد رقص ختم ہو گیا ـــ ایک مرتبہ پھر ہر شئے خاموش تھی۔ اور اسی خاموشی کو چیرتی ہوئی فنکاتا کی آواز بلند ہوئی۔

"اخناتون مصری کی آخری وارث ـــ مصری تہذیب کی زندہ تصویر، اور سیتی اول کے دور کے جیتے جاگتے مجسمے ـــ تیرے غلاموں کا غلام ـــ تیری ہی طرح دیوی عشتار کی رحمتوں کا پیاسا فنکاتا تیرے حضور میں قوت حیات کا سب سے قیمتی تحفہ پیش کرنے کی اجازت مانگتا ہے"

اور زلیخا نے گردن ہلا کر یہ اجازت دیدی۔

اجازت پاتے ہی فنکاتا نے ایک تیز خنجر فضا میں بلند کر کے اپنے شانے پر پوری قوت سے مارا۔ خون کا ایک فوارہ سا بلند ہوا فنکاتا نے یہ خون اپنے دونوں ہاتھوں میں بھرا۔ اور تکلیف کا اظہار کئے بغیر یہ خون چبوترہ پر

•

زلیخا کے قدموں کے قریب بکھیر دیا۔

نہ صرف سلیم بلکہ تمام ہندوستانی سیاح یہ خونی تحفہ دیکھ کر لرز گئے' لیکن زلیخا بالکل پرسکون رہی اور اس نے کہا۔ "قبیلۂ فراز کے مردار۔ تجھ پر دیوتاؤں کی ہر ممکن رحمتوں کی بارش ہو۔ اور تجھے مرنے کے بعد آسمان کے اس گوشے میں جگہ ملے جہاں صرف خدا کے برگزیدہ بیٹے ہی قیام کرتے ہیں۔"

زلیخا کی زبان سے یہ دعائیہ کلمے نکلتے ہی ایک مرتبہ پھر رقص شروع ہوا فضا میں موسیقی پھیلی اور ماحول میں ایک مرتبہ پھر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ لیکن یہ رقص زیادہ دیر تک جاری نہیں رہا۔ رقص رکا اور فنگا نے چیخ کر کہا۔ "شہزادی زلیخا۔ تو مس سوم کی روح شادی کی آخری رسم دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہی ہے۔ اس لیے اپنے شوہر کے منہ میں اپنی زبان دیکر منحوس اسپاتا کے تابوت میں فنا کی آخری کیل ٹھونک دیجیے۔"

اب زلیخا نے عورت کی ازلی اور ابدی مسکراہٹ کے ساتھ سلیم کی طرف دیکھا۔ اس کے بالکل قریب آ گئی۔ اپنی دھڑکتی ہوئی چھاتی اس کے تمناؤں اور حسرتوں سے بھرپور سینے سے لگائی۔ اپنی نازک انگلیاں اس کے ہاتھوں میں پھنسائیں' اپنے یاقوتی لب اس کے لبوں سے ملائے' اپنی زبان اس کے پیاسے ہونٹوں پر پھیری اور ان لبوں کی چاشنی حاصل کرنے کے بعد اپنی زبان اس کے منہ میں داخل کر دی۔ سلیم نے بھی زلیخا کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

رسم ادا ہوتی رہی۔ احسن زلیخا کی زبان چوستا رہا۔ طبل کی آواز تیز سے تیز تر ہوتی رہی۔ لیکن اچانک سلیم کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ اسکی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ اعصاب شل ہونے لگے۔ اور ابھی زلیخا کی زبان اس کے منہ میں ہی تھی کہ وہ کسی سوکھے درخت کی شاخ کی طرح سنگی چبوترہ پر گر پڑا۔

سلیم کے گرتے ہی عاذم الدین طرانی اور ڈاکٹر بیگ چبوترے پر چڑھ آئے۔ لیکن وہاں اب کیا تھا۔ سلیم کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی۔ کسی تیز زہر نے اس سے اسکی زندگی چھین کر اسے موت کے حوالے کر دیا تھا، وہ بالکل مردہ تھا۔ ڈاکٹر بیگ نے پہلے سلیم کے جسم کا طبی معائنہ کر کے اسکی موت کی تصدیق کی اور اس کے بعد موت کا فوری سبب دریافت کرنے کے لیے زلیخا کی زبان کا طبی معائنہ کیا۔

سلیم مر چکا تھا لیکن زلیخا زندہ تھی اور پتھرائی ہوئی ساکت و جامد نظروں سے مردہ سلیم کے اکڑے ہوئے جسم کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ڈاکٹر بیگ نے انتہائی مغموم اور افسردہ لہجے میں اعلان کیا۔ "دوستو! مجھے بہت افسوس ہے کہ سلیم مر چکا ہے اور اسکی موت کا واحد سبب صرف وہ زہر ہے جو ہزاروں سال کی مسلسل نیند اور اعصاب کے سکوت و جمود نے زلیخا کے جسم کے ہر اس حصے میں پیدا کر دیا تھا جو خشک نہیں تر ہے۔ چنانچہ جیسے ہی سلیم نے شہزادی کی زبان چوسی۔ زہر اس کے جسم میں دوڑنے لگا۔ حد یہ کہ خون کے سرخ ذرات مر گئے اور زندگی اسے الوداع کہہ کر چلی گئی۔"

ڈاکٹر بیگ اپنا جملہ ختم کرتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔ اور عازم الدین دوڑ کر اپنے اکلوتے بیٹے کی لاش سے چمٹ گیا۔۔

لیکن دلہن بنی ہوئی زلیخا رونے اور آنسو بہانے کے بجائے ہنس دی۔ — آنسو انتہائی غم کے اظہار کا ذریعہ ہیں مگر کچھ آنسو وہ بھی ہوتے ہیں جو آنکھوں سے بہنے کے بجائے سینے میں ٹھہر کر ایک طوفان برپا کر دیتے ہیں اور انسان اس طوفان کو روکنے کے لیے قہقہہ مار کر ہنس دیتا ہے — ایک بھیانک اور درد انگیز ہنسی — لیکن یہ ہنسی بھی زیادہ دیر باقی نہ رہی — اس نے کہا "احمس — اے میرے محبوب، تم مجھے اپنی محبت کا میٹھا راگ سنائے بغیر اس دنیا میں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے — اور اسیاتا کی دھمکی سچی ثابت ہوئی — لیکن اب یہ نہیں ہوسکتا کہ تم آسمان کی نیلی نیلی فضاؤں میں تنہا پرواز کرسکو —۔

درد اور کرب میں ڈوبی ہوئی ایک ہلکی آواز میں زلیخا نے مزید کہا — "احمس میں نے انتہائی قربانیوں کے بعد تمہارے وجود کو چاروں طرف سے سمیٹ کر اپنی زندگی میں شامل کیا تھا لیکن تمہیں پانے کے بعد تمام مسرتیں پلک جھپکتے میں زائل ہو گئیں اور اب میں پھر تنہا ہوں — لیکن اے میرے محبوب ایسا نہیں ہوسکتا — یہ بالکل ناممکن ہے کہ میں تمہاری موت اور اسیاتا کی کامیابی کے سامنے خاموشی سے سر جھکا دوں اپنی شادی کے اس مسرت بھرے ہنگامہ میں اپنی امنگوں کو سسک سسک کر دم توڑتے دیکھتی رہوں اور اپنی آرزوؤں کے چشمے پر صبر کا پتھر رکھ دوں — اس لیے اے میری رفیق اگر تم

سُن سکتے ہو تو سن لو کہ میری آیندہ زندگی میرے بس میں نہیں رہی ہے۔ میں اپنا دل ویران یادوں کے حوالے نہیں کر سکتی ہے۔ تم مرنے کے بعد بھی میرے دل سے دور نہیں ہو سکتے ہے۔ میں تمھاری تصویر اپنے ٹوٹے ہوئے دل سے لگا کر زندہ نہیں رہ سکتی ہے۔ تمھارے وجود اور تمھاری محبت کا عکس میرے ذہن سے کبھی نہیں مٹ سکتا ہے۔ تمھارے بغیر میں اپنی زندگی کو بنجر صحراؤں یا گرم ریگزاروں کے حوالے نہیں کر سکتی ہے۔ اور میری آنکھوں میں تمھاری فردوسی محبت کا جو چراغ ٹمٹما رہا ہے میں اسے نہیں بجھا سکتی ہے۔ احسن ۔۔۔ اے میری آرزوئے حیات کے درخشاں ستارے مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ لیکن اگر شکوہ ہے تو اپنی تقدیر کی لکیروں سے ۔۔۔

تم میرے جسم میں پھیلے ہوئے زہر کو امرت سمجھ کر پی گئے ہو۔ تم کامیاب و کامران اور بیقصور ہو ۔۔۔ لیکن میں ناکام بھی ہوں اور خطاوار بھی اور آئین وفا یہ نہیں ہے کہ موت کے بعد تمھارا ساتھ نہ دوں ہے۔

زلیخا نے یہ جملہ کہا اور دم بخود کھڑے ہوئے ننگاما کی کمر سے خنجر نکال کر اپنی چھاتی کی انتہائی گہرائیوں میں پیوست کر دیا ہے۔ اب زلیخا بھی سلیم کے قریب اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی تھی ۔۔۔

" ننگاما ۔۔ میرے قریب آؤ " دم توڑتی ہوئی زلیخا نے کہا " میرے پاس وقت نہیں کہ میں تم سے تفصیلی بات کر سکوں ۔۔ لیکن میری آخری وصیت غور سے سُن لو ۔۔ میرے مرنے کے بعد یہ تمھارا کام ہے کہ تم میری اور میرے احسن کی لاشوں کو میرے خاندانی قبرستان لیجاؤ اور ہم دونوں کو ایک ہی تابوت

میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے لٹا دو تاکہ احمس کو قریب دیکھنے کی جو حسرت میں اپنی زندگی میں پوری نہ کرسکی وہ مرنے کے بعد پوری ہو جائے ـــــ"

نگاتا ابھی جواب بھی نہ دینے پایا تھا کہ سب کے دیکھتے ہی دیکھتے زلیخا نے زندگی کی آخری ہچکی لی اور سرد ہو گئی ــــ ۔

اور اس طرح یہ کہانی ختم ہو گئی ــــ ۔

لیکن یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی اس لیے کہ کوئی نہیں جانتا کہ قبیلۂ فراز کے پُر اسرار آدمی نگاتا کی قیادت میں زلیخا اور احمس کی ناکام جوانیوں کی لاشیں لیکر کہاں چلے گئے ــ یہ لاشیں دفن بھی ہوئیں یا نہیں ـــ یا نگاتا نے ان کی لاشوں کو ممی بنا کر ان کا مشترکہ تابوت کسی قدیم مقبرہ کے زمین دوز تہ خانے میں رکھدیا ــ اور اس طرح کسی نئی کہانی کی بنیاد رکھدی ــــ ۔

طہرانی، عاذم الدین، ڈاکٹر بیگ اور پروفیسر ارشد نے صرف یہ دیکھا کہ نگاتا کے آدمی ایک دولہا اور ایک دلہن کی لاشوں کو لیکر جن کے مُردہ چہروں پر موت کا ہلکا سا بھی عکس نہیں تھا کھنڈرات کی پھیلی ہوئی تاریکی میں تحلیل ہو رہے ہیں ــ کسی انجانی منزل کی طرف ــ یا ماضی کی طرف ــــ مستقبل کی طرف،

آج زلیخا دوسری مرتبہ مری تھی ــــ اور یہ زلیخا نہیں مری تھی تاریکی انتہائی گہرائی سے نکلتی ہوئی روشنی مری تھی ــــ ۔

آج زلیخا نے احمس کی خاطر دوسری مرتبہ خودکشی کی تھی ــــ اور اس کی خودکشی نے محبت کے اس لافانی شعلہ کو بجھا دیا تھا جس کو اس نے اپنے لہو کی

چنگاری سے جلا کر ہزاروں سال تک باقی رکھا تھا۔

آج زلیخا کا جنازہ دوسری مرتبہ اٹھا تھا۔ اور اس جنازہ کے منظر نے جیسے پوری کائنات کا ماحول بدل دیا تھا۔ فضاؤں کو اداس کر دیا تھا خلاؤں میں موت کی خاموشی پھیلا دی تھی۔ وقت کی رفتار کو ٹھہرا دیا تھا، ستاروں کی چمک ماند کر دی تھی، چاند کی کرنوں کو رلا دیا تھا اور رات کو ایک المناک سکوت کے گہوارہ میں سلا دیا تھا۔

ہندوستانی سیّاحوں کی یہ پارٹی قبیلۂ زاند کے غمزدہ افراد کے کاندھوں پر زلیخا اور احمس کی لاشوں کی روانگی کا یہ دلخراش منظر ساکت و جامد بتوں کی طرح دیکھتی رہی۔ لیکن جواں سال اکلوتے بیٹے کا باپ اس موت کو کیسے برداشت کرتا۔؟

عازم الدین کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی! اور وہ بھی بیہوش ہو گیا۔

• تمام شد •

سلامت علی مہدی
محلہ رستم نگر ——— لکھنؤ

مورخہ ۱۳/اگست ۱۹۷۰ء

یہ ناممکن ہے کہ آپ نے سلامت علی مہدی کا

ناول

زمرّد

نہ پڑھا ہو اور آپ نے اُسے پسند نہ کیا ہو ۔۔ اسلیئے

اب ملاحظہ فرمایئے

زمرّد کے بعد

سلامت علی مہدی کا تیسرا ہیبتناک اور بھیانک

ناول

ایک ایسی داستان ۔۔ جسمیں فرقہ، کردگارہ کا

انجام اور ایک ایسی ابتدا ہے ۔ جو آپ کے

رونگٹے کھڑے کر دے گی

فوراً آرڈر بھیجیے

ضخامت ..۴۰ صفحات : ۔۔۔ قیمت چھ روپے

پرواز بکڈپو ۔ نظیر آباد لکھنؤ

پرواز بکڈپو کے شائع کردہ چند بہترین ناول

کافرستان	سلامت علی مہدی	5.00
دوراہا	عارف مارہروی	3.50
بیگم بادشاہ غلام	شوکت تھانوی	3.00
دل ناداں	خان محبوب طرزی	2.50
دلجیت	وحشی محمود آبادی	4.50
فتح ارکوس	″	4.50
رفتار	″	3.50
کھلاڑی	″	.00
حمام	مائل ملیح آبادی	.00
سایۂ صنم	″	.50
ساحل سے دور	مرد: رمحمود	3.50
مارشل لا	شوکت تھانوی	.25
محبت کے سہارے	ضیاء عظیم آبادی	.00
رنگین خواب	″	.50
ماحول	″	.75

ملنے کا پتہ: پرواز بکڈپو نظیر آباد۔ لکھنؤ